ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کا عروج و زوال

Shopping for BOMBS

by Gordon Corera

قاضی اختر جونا گڑھی

SHOPPING FOR BOMBS

(URDU TRANSLATION)

Translated by: Qazi Akhter Junagari

نام کتاب : ڈاکٹر عبدالقدیر نیٹ ورک کا عروج وزوال

اشاعت اول : ۲۰۰۸ء

پیش کش : ساجد رحمٰن فضلی

ناشر : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تقسیم کار

فضلی بک سپر مارکیٹ

(92-21) 2212991 - 2629724

e-mail: fazleebook@hotmail

کتاب سرائے

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اردو بازار، لاہور۔ فون: (92-21) 7320318

e-mail: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

SHOPPING FOR BOMBS

(URDU TRANSLATION)

Translated by: Qazi Akhter Junagari

نام کتاب	:	ڈاکٹر عبدالقدیر نیٹ ورک کا عروج وزوال
اشاعت اول	:	۲۰۰۸ء
پیش کش	:	ساجد رحمٰن فضلی
ناشر	:	فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تقسیم کار

کتاب سرائے
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور۔ فون: 7320318 (92-21)
e-mail: hikmat100@hotmail.com

لی بک سپر مارکیٹ
یو پاکستان، اردو بازار، کراچی
(92-21) 2212991 - 262
e-mail: fazleebook@hot

ترتیب

ترتیب

حرفِ اولیں

پاکستان کے نامور سائنس دان اور اسلامی ایٹم بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی شخصیت بین الاقوامی سطح پر شہرت کی حامل ہے جو عالم اسلام کا ایک ایسا مایہ ناز سپوت ہے کہ پوری مسلم دنیا اس کے بے نظیر کارنامے کی وجہ سے اُسے اپنا محسن اور ہیرو تسلیم کرتی ہے۔ یورینیم کی افزودگی کے ارزاں طریقے کی دریافت پر انھیں عالمی سطح پر بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۶ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے، اپنی ابتدائی تعلیم وہیں مکمل کی اور قیام پاکستان کی وجہ سے ۱۹۵۲ء میں ہجرت کر کے کراچی منتقل ہو گئے۔ ڈی جے سائنس کالج سے بی ایس سی کر کے وہیں سرکاری ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ بعد طبیعت ملازمت پر آمادہ نہ رہی۔ ملازمت ترک کر کے میٹالرجی کی جدید ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے برلن چلے گئے۔ وہیں پر انھیں پروفیسر ڈبلیو جی برجرز کی رفاقت اور رہنمائی میسر آئی۔ ۱۹۷۶ء میں پاکستان واپس آ گئے۔ اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے، انھوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ''کہوٹہ ایٹمی پلانٹ'' قائم کرنے کی ترغیب دی اور ہر ممکن طریقے سے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر خان کی صلاحیتوں کے باعث ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا: ''ہم گھاس کھا لیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔'' ۱۹۷۹ء میں مغربی میڈیا نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بدنام اور رُسوا کرنے کے لیے ایک منظم تحریک چلائی تھی اور انھیں ہالینڈ کے خلاف سازش کا مرتکب قرار دیا تھا۔ اس ضمن میں مغربی ذرائع ابلاغ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اس لیے کہ مغربی دنیا کو بخوبی معلوم تھا کہ ڈاکٹر خان ایک ذہین و

فطین انجینئر اور سائنس دان ہیں اور انھیں ایٹم کی افزودگی کا ایک ایسا قیمتی اور نایاب نسخہ معلوم ہے۔ جس کی بنا پر وہ چاہیں تو ارزاں طریقے پر آسانی سے ایٹم بم تیار کر سکتے ہیں۔ یہ بات مغرب کو کسی صورت گوارا نہ تھی کہ پاکستان جیسا اسلامی ملک بھی ایٹمی برادری کا رکن بننے کے لائق ہو جائے اور یوں وہ اپنے دفاع کے لیے کوئی مستحکم نظام مہیا کر سکے۔ چنانچہ یہ سازشیں اس صورت میں وجود میں آئیں کہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو ہالینڈ میں ڈاکٹر عبد القدیر خان کو ایٹمی راز چرا کر پاکستان لے جانے کے ناجائز الزام میں چار سالہ قید کی سزا سنائی گئی۔ حکومت پاکستان نے اس مقدمے کی پیروی کے لیے پاکستان کے معروف وکیل ایس ایم ظفر کو مقرر کیا۔ چنانچہ کوئی ثبوت فراہم نہ ہو سکنے کی بنا پر ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر خان رہا کر دیئے گئے۔ یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ''کہوٹہ ایٹمی پلانٹ'' کا نام بدل کر ''ڈاکٹر عبد القدیر خان ریسرچ لیبارٹریز'' کے نام کی منظوری دے دی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم محض کسی خاص گروہ کی میراث نہیں، مغرب ہو یا مشرق سب اس کے حصول اور ترسیل و تقسیم میں برابر کے شریک ہیں۔ بڑی طاقتوں اور سپر پاورز نے ایٹمی راز چھوٹی طاقتوں سے اسی طرح چھپا کر رکھے ہوئے تھے جس طرح کسی زمانہ میں چینیوں نے ریشم کی صنعت دنیا سے چھپائی ہوئی تھی لیکن جب ان عالمی چودھریوں کو معلوم ہوا کہ پاکستان کا ایک سپوت اس کا فارمولا نہ صرف اپنے ذہن میں بٹھانے میں کامیاب ہو گیا ہے بلکہ اپنے وطن پاکستان میں ایک ایٹمی مرکز قائم کرنے کی غرض سے انھیں سے ضروری سامان بھی خریدتا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ آج تک پاکستان کی ایٹمی صلاحیت پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے آ رہے ہیں کیونکہ مغربی دنیا اور

بالخصوص امریکہ و برطانیہ پاکستان کو اس پوزیشن میں دیکھنا نہیں چاہتے کہ وہ خود اپنی حفاظت کا انتظام کر سکے۔ ایسے ہی حربوں سے وہ پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک کو کھوکھلا کر دینا چاہتے ہیں اور اپنا ذہنی و فکری غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں حالات کبھی یکساں نہیں رہے۔ سیاسی اور معاشی نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ آئے روز عالمی سطح پر دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ موجودہ دنیا ایک بہت بڑی کشمکش اور تصادم کے ماحول سے گزر رہی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد سے دنیا دو طبقات میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طبقہ اس فکر کا مدعی ہے کہ یہ کش مکش، یہ پیکار، یہ تصادم اور محاذ آرائی ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کا ثمرہ ہے جبکہ بعض دیگر لوگوں کی رائے میں یہ مذہبی نوعیت کی جنگ ہے۔ اس لیے کہ کمیونزم کے علمبردار؛ روس کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد مغربی دنیا اور بالخصوص امریکہ ماضی کی سرد جنگ کی روایات کو بدستور قائم رکھنے کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ گذشتہ چار عشروں تک جو جنگ کمیونسٹ روس اور مشرقی یورپ کے خلاف لڑی گئی اب اس کا رخ دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ گویا یہ ایک نئی سرد جنگ کا آغاز ہے جو اب اس اصطلاح سے آزاد ہو کر ''گرم جنگ'' کے لبادے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جس کے مظاہر افغانستان اور عراق میں بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں اور جس کا اگلا ممکنہ نشانہ ہمارا پڑوسی مسلمان ملک ایران بننے والا ہے۔ یہ صورت حال بالیقین غیر معمولی حد تک تشویشناک اور اضطراب انگیز ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان آنے والے ان خطرات کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ مغرب اور بالخصوص امریکہ کے ذرائع ابلاغ، اخبارات، رسائل و جرائد اور کتابوں میں مسلمانوں کے بارے میں جو منفی تاثرات اور پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اس کا بہت کم حصہ ہم تک پہنچ پاتا ہے اور ہم من حیث المجموع ان تاثرات، خیالات اور افکار سے بے خبر اور لاعلم ہی

فطین انجینئر اور سائنس دان ہیں اور انھیں ایٹم کی افزودگی کا ایک ایسا قیمتی اور نایاب نسخہ معلوم ہے جس کی بنا پر وہ چاہیں تو ارزاں طریقے پر آسانی سے ایٹم بم تیار کر سکتے ہیں۔ یہ بات مغرب کو کسی صورت گوارا نہ تھی کہ پاکستان جیسا اسلامی ملک بھی ایٹمی برادری کا رکن بننے کے لائق ہو جائے اور یوں وہ اپنے دفاع کے لیے کوئی مستحکم نظام مہیا کر سکے۔ چنانچہ یہ سازشیں اس صورت میں وجود میں آئیں کہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو ہالینڈ میں ڈاکٹر عبد القدیر خان کو ایٹمی راز چرا کر پاکستان لے جانے کے ناجائز الزام میں چار سالہ قید کی سزا سنائی گئی۔ حکومت پاکستان نے اس مقدمے کی پیروی کے لیے پاکستان کے معروف وکیل ایس ایم ظفر کو مقرر کیا۔ چنانچہ کوئی ثبوت فراہم نہ ہو سکنے کی بنا پر ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر خان رہا کر دیے گئے۔ یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے "کہوٹہ ایٹمی پلانٹ" کا نام بدل کر "ڈاکٹر عبد القدیر خان ریسرچ لیبارٹریز" کے نام کی منظوری دے دی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم محض کسی خاص گروہ کی میراث نہیں، مغرب ہو یا مشرق سب اس کے حصول اور ترسیل و تقسیم میں برابر کے شریک ہیں۔ بڑی طاقتوں اور سپر پاورز نے ایٹمی راز چھوٹی طاقتوں سے اسی طرح چھپا کر رکھے ہوئے تھے جس طرح کسی زمانہ میں چینیوں نے ریشم کی صنعت دنیا سے چھپائی ہوئی تھی لیکن جب ان عالمی چودھریوں کو معلوم ہوا کہ پاکستان کا ایک سپوت اس کا فارمولا نہ صرف اپنے ذہن میں بٹھانے میں کامیاب ہو گیا ہے بلکہ اپنے وطن پاکستان میں ایک ایٹمی مرکز قائم کرنے کی غرض سے انھیں سے ضروری سامان بھی خریدتا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ آج تک پاکستان کی ایٹمی صلاحیت پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے آ رہے ہیں کیونکہ مغربی دنیا اور

بالخصوص امریکہ و برطانیہ پاکستان کو اس پوزیشن میں دیکھنا نہیں چاہتے کہ وہ خود اپنی حفاظت کا انتظام کر سکے۔ ایسے ہی حربوں سے وہ پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک کو کھوکھلا کر دینا چاہتے ہیں اور اپنا ذہنی و فکری غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں حالات کبھی یکساں نہیں رہے۔ سیاسی اور معاشی نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ آئے روز عالمی سطح پر دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ موجودہ دنیا ایک بہت بڑی کشمکش اور تصادم کے ماحول سے گزر رہی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد سے دنیا دو طبقات میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طبقہ اس فکر کا مدعی ہے کہ یہ کش مکش، یہ پیکار، یہ تصادم اور محاذ آرائی "تہذیبوں کے ٹکراؤ" کا ثمرہ ہے جبکہ بعض دیگر لوگوں کی رائے میں یہ مذہبی نوعیت کی جنگ ہے۔ اس لیے کہ کمیونزم کے علمبردار؛ روس کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد مغربی دنیا اور بالخصوص امریکہ ماضی کی سرد جنگ کی روایات کو بدستور قائم رکھنے کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ گذشتہ چار عشروں تک جو جنگ کمیونسٹ روس اور مشرقی یورپ کے خلاف لڑی گئی اب اس کا رخ دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ گویا یہ ایک نئی سرد جنگ کا آغاز ہے جو اب اس اصطلاح سے آزاد ہو کر "گرم جنگ" کے لبادے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جس کے مظاہر افغانستان اور عراق میں بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں اور جس کا اگلا ممکنہ نشانہ ہمارا پڑوسی مسلمان ملک ایران بننے والا ہے۔ یہ صورت حال بالیقین غیر معمولی حد تک تشویشناک اور اضطراب انگیز ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان آنے والے ان خطرات کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ مغرب اور بالخصوص امریکہ کے ذرائع ابلاغ، اخبارات، رسائل و جرائد اور کتابوں میں مسلمانوں کے بارے میں جو منفی تاثرات اور پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اس کا بہت کم حصہ ہم تک پہنچ پاتا ہے اور ہم من حیث المجموع ان تاثرات، خیالات اور افکار سے بے خبر اور لاعلم ہی

رہے ہیں جو اہل مغرب کی جانب سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک خاص زاویہ نظر سے پوری دنیا میں پھیلائے جا رہے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہریوں کو ایٹم بم کی اذیتوں اور ہلاکتوں سے آشنا کرنے والے "امریکی" اب دنیائے اسلام کے سب سے بڑے اور ایٹمی صلاحیت کے حامل ملک پاکستان کے مایہ ناز فرزند ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جنھیں پوری پاکستانی قوم اپنے محسن کا درجہ دیتی ہے بلکہ مسلم امہ کے قومی ہیرو کے طور پر ان کا احترام کرتی ہے کیونکہ وہ پاکستانی یا بہ الفاظ دیگر "اسلامی ایٹم بم" کے خالق ہیں۔ انھوں نے پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے روشناس کرایا۔ بس یہی ان کا جرم ہے۔ اس جرم کی سزا دینے کے لیے انھیں دنیا بھر میں ایٹمی راز بلیک مارکیٹ میں فروخت کرنے کا بھی مجرم قرار دیا جا رہا ہے۔ صرف یہیں تک ہی بس نہیں کیا بلکہ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ "ڈاکٹر عبدالقدیر خان، اسامہ بن لادن سے کم خطرناک نہیں ہیں۔"

حال ہی میں مغربی دنیا کے نمائندہ ایک برطانوی نژاد صحافی گورڈن کوریرا (Gordon Corera) کی ایک کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا عنوان ہے:

Shopping For Bombs (Nuclear Proliferation, Global Insecurity and the Rise and Fall of the A.Q. Khan Network)

یہ کتاب درحقیقت ایک "فردِ جرم" کا درجہ رکھتی ہے جو اس مایہ ناز فرزندِ قوم پر عاید کی گئی ہے۔ مسلم امہ کے ارباب فکر و دانش کی یہ ملی اور دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے افکار و خیالات سے جو مسلمانوں کے خلاف پوری دنیا میں پھیلائے جا رہے ہیں، پوری مسلم

دنیا کو آگاہ رکھیں۔ یہ افکار و تاثرات مخالفانہ، منفی اور دشمنی و نفرت پر مبنی ہی سہی لیکن ان سے آگاہ رہنا ہم سب کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے دشمن کی سوچ اور عزائم سے پوری طرح روشناس رہ سکیں۔ جھوٹ یا سچ، ہمارے بارے میں جو کچھ بھی کہا اور لکھا جا رہا ہے اس کا ہمارے علم میں ہونا ضروری ہے تاکہ ہم حقائق کی میزان پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکیں۔ یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ عین مناسب وقت پر ملت اسلامیہ کی جانب سے اس اہم فریضے کی ادائیگی کی سعادت ادارہ "روزنامہ جنگ" کے حصے میں آئی جس نے معروف دانش ور اور صاحب نظر قلم کار محترم جناب قاضی اختر جونا گڑھی صاحب سے اس کتاب کا ترجمہ اور تلخیص کروا کر "جنگ سنڈے میگزین" میں مارچ ۲۰۰۷ء سے جولائی ۲۰۰۷ء تک اسے بالاقساط شایع کیا۔

اب انھی اقساط پر مبنی ترجمہ و تلخیص کو "ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کا عروج و زوال" کے زیر عنوان کتابی صورت میں شایع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ جنگ نے بھی اس بات کی وضاحت کر دی تھی اور ہمارے اشاعتی ادارے کے لیے بھی اس وضاحت کا اعادہ ضروری اور لابدی ہے کہ اس کتاب کے مندرجات، حقائق، واقعات اور انکشافات سراسر مصنف کتاب "گورڈن کوریرا" کے اپنے ہیں۔ جنھیں پوری غیر جانبداری اور دیانتدارانہ احساس کے ساتھ ارباب علم اور قارئین کے علم میں لانا ضروری سمجھا گیا تاکہ وہ کسی بھی شب خون کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو سکیں۔

امید ہے معزز قارئین ہماری اس کاوش کو اسی تناظر میں لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات ہمارے لیے کل بھی قابل احترام اور محسن قوم کے درجے پر فائز تھے، اس کتاب کے پڑھنے کے بعد بھی ہمارے اذعان و ایمان میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ ایک صد ایک کتابیں

مزید لکھ کر بھی ان کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر لی جائے تو بھی ہماری نگاہوں میں ان کے وقار اور عظمت میں اضافہ ہی ہوگا۔ ہمارے پاس انھیں دیکھنے کے لیے عینک ہی الگ ہے جو اگرچہ ہے تو دیکھنے کے لیے ہی لیکن یہ محض تعصب اور یک طرفیت کی آلائشوں سے آلودہ نہیں ہے کہ دوسرے رُخ دیکھنے میں اسے کوئی ناگواری محسوس ہوتی ہو جیسا کہ مغربی ذرائع ابلاغ کا وطیرہ ہے کہ تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کی بجائے اپنی پسند اور خواہش کا رخ دیکھنا ان کے من کو بھاتا ہے۔

محترم قارئین! اگر مغرب کے اس کردار کو سمجھنے کی سنجیدہ خواہش ہے تو پاکستان کے معروف دانشور اور عالمی سیاسیات کے رموز و اسرار کے باوثوق اور محققانہ طرز استدلال کے حامل مبصر جناب اسرار الحق کی فاضلانہ تصنیف American's Moment of Truth: The End of Illusions, Islam's Ecounters with the west کا مطالعہ بھی خاصہ چشم کشا اور بصیرت خیز ثابت ہوگا۔ حوالہ جات سے مزین اور حجت و برہان کے زیور سے آراستہ اس کتاب کے چھٹے باب کا ترجمہ ادارہ ہذا سے ''اسلام اور مغرب کا تصادم'' کے عنوان سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جبکہ بقیہ ابواب کا ترجمہ ''اسلامی جنگجوئی اور اس کا سدباب'' کے نام سے عنقریب چھپ کر منظر عام پر آنے والا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ عالمی سطح پر مغرب کی بالعموم اور امریکہ کی بالخصوص دورنگی، یک طرفیت دہرے معیار، اسلام دشمنی اور تعصب و عناد پر مبنی ان کے طرز عمل کے بارے میں حقائق و انکشافات کا آئینہ ثابت ہوگا جس سے مغرب کے اصلی اور نقاب کے نیچے چھپے ہوئے چہرے کو پہچاننے میں گراں قدر مدد ملے گی۔ امید ہے ارباب علم بالعموم اور مسلم امہ کے افراد بالخصوص خلوص نیت اور ملی جذبے سے سرشار ہو کر ہماری ان علمی کاوشوں کو قدر

شناسی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ قارئین کرام سے آخری اور اہم ترین گزارش پھر سے یہی ہے کہ ڈاکٹر قدیر خان کے بارے میں گورڈن کوریا کی کتاب کے مندرجات کو اسی مصنف کے فکری اظہار کے پس منظر میں رکھ کر پڑھیں جس سے ادارہ کا اتفاق نہ کل تھا، نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہی کسی مرحلے پر ہوگا۔ اس لیے کہ عالمی سازشیں تو رہیں ایک طرف خود ہمارے وطن عزیز پاکستان میں قیام پاکستان سے لے کر تادمِ تحریر ایسے ایسے پر اسرار اور معمہ نما واقعات ہوتے رہے ہیں کہ جن کی کنہ تک پہنچنا کار دارد رہا ہے۔ قائداعظم کے آخری مرض کے علاج کے بارے میں چہ میگوئیاں تاریخ کے اوراق میں موجود ہیں۔ لیاقت علی خان کی شہادت آج تک ایک لاینحل چیستان ہے۔ مادر ملت کی موت بھی قوم کے ذہنوں پر کئی سوالات چھوڑ گئی تھی۔ ہمارے یہاں کی حکومتوں اور حکمرانوں کی تبدیلی میں کچھ نادیدہ اور چھپی ہوئی قوتیں کارفرما رہتی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے حقیقی محرکات آج تک پردۂ راز میں ہیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے کی بیرونِ ملک پراسرار ہلاکت اور بڑے بیٹے شاہنواز کی خود اپنی بہن کی وزارت عظمٰی کے زمانے میں عبرت خیز ہلاکت بھی ایک معمہ ہے۔ خود بے نظیر بھٹو ۲۰۰۷ء کے الیکشن کے سلسلے میں ناصر باغ راولپنڈی میں انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے نادیدہ ہاتھوں کی گولیوں کا نشانہ بنی ہیں۔ اور یہ سطور لکھنے تک مذکور تمام واقعات پر پراسراریت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہماری حکومتوں اور حکمرانوں کی ڈور کا سرا ہمیشہ کسی اور کے ہاتھ میں رہا ہے اور یہ کٹھ پتلیوں کی طرح ان کی اغراض کے مہرے بنے رہتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہمیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے معاملے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے کہ ۲۸ مئی ۲۰۰۸ء کو یومِ تکبیر اور اس کے بعد کے اخبارات میں دیے گئے ڈاکٹر خان کے بیانات اس بات کو عیاں کرتے ہیں کہ ''اعتراف جرم'' ان

سے بیرونی دباؤ کے تحت کرایا گیا اور وہ وقت آنے پر سب حقائق کو طشت از بام کریں گے۔

اس لیے ہمیں پوری سنجیدگی سے ان سب عوامل پر غور کر کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔
دعا ہے کہ رب کریم مسلمان امہ کی منتشر صفوں میں اتحاد و یکجہتی کی روح پیدا فرمادے
تاکہ انھیں اپنے دوست اور دشمن کی پہچان کا سلیقہ میسر آسکے۔ یہی وقت کی سب سے بڑی
آواز اور مسلمانوں کی سب سے ناگزیر ضرورت ہے۔

محمد شبیر قمر

۲۸ مئی ۲۰۰۸ء

☆......☆......☆

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کا عروج و زوال

تمہید

جوہری ٹیکنالوجی کی عالمی بلیک مارکیٹ میں انتہائی حساس نوعیت کے جوہری
راز فروخت کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بین الاقوامی شہرت حاصل
ہے۔ امریکی سی آئی اے کے ایک سابق ڈائریکٹر کے بقول ''عبدالقدیر خان، اسامہ بن
لادن سے کم خطرناک شخص نہیں۔'' بہرکیف پاکستان میں تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قومی
ہیرو کا رتبہ حاصل ہے۔ انھیں ''پاکستانی ایٹم بم'' کا خالق سمجھا جاتا ہے، تاہم حقائق اور
واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک ایسا بین الاقوامی بلیک مارکیٹ نیٹ ورک
قائم کیا جس کے ذریعے انتہائی اہم، حساس اور نازک جوہری راز ایران، شمالی کوریا اور
لیبیا کو فراہم کیے گئے۔ ''گورڈن کوریرا'' بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں جو سیکیورٹی
کارسپانڈینٹ کی حیثیت سے بی بی سی کے لیے خدمات انجام دیتے ہیں، چنانچہ انھوں
نے عالمی دہشت گردی کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کے علاوہ دنیا بھر میں
جوہری پھیلاؤ اور بین الاقوامی سلامتی کے مسائل کے بارے میں بھی بی بی سی ٹیلیویژن،
ریڈیو اور آن لائن پر برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس برادری کے اقدامات اور مہمات کے
بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ آکسفورڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے ہیں
اور ۱۹۹۷ء سے بی بی سی کے لیے کام کر رہے ہیں۔

گورڈن کوریرا کا دعویٰ ہے کہ اپنی کتاب "Shopping for bombs"

(بموں کی خریداری) میں انھوں نے پہلی مرتبہ ان حقائق اور واقعات سے پردہ اٹھایا ہے جن کا تعلق اے کیو خان نیٹ ورک کے عروج وزوال کی اندرونی کہانی اور گذشتہ تین عشروں کے دوران جوہری ٹیکنالوجی کے تباہ کن پھیلاؤ میں ان کے مبینہ کردار سے رہا ہے۔ اسلام آباد، لندن اور واشنگٹن میں انتہائی اہم کلیدی شخصیات سے کیے جانے والے خصوصی نوعیت کے انٹرویوز پر مبنی حقائق اور واقعات کے ساتھ ساتھ عبدالقدیر خان کے اپنے نیٹ ورک سے تعلق رکھنے والے افراد سے تفصیلی گفت وشنید کے بعد بی بی سی کے صحافی گورڈن کوریرا نے دنیا میں وجود پذیر ہونے والی ایسی ممکنہ جوہری، اسلحے کے منڈی اور جوہری ہتھیاروں کے بازار کی سچی تصویر کشی کی ہے اور یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ پاکستان کے نامور ایٹمی سائنسدان اور ایٹم بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے دنیا کی غنڈہ گردی میں ملوث بدمعاش ریاستوں سے طے پانے والے جوہری ٹیکنالوجی اور رازوں کے سودے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟؟ کوریرا نے یہ بھی بتایا ہے کہ پاکستانی حکومت اور قوم میں اپنی معزز حیثیت اور قابل احترام رتبے اور اعلیٰ مقام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں جو تحفظ اور سہولتیں مہیا کی گئی تھیں ان کے پردے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے خود کو اس قابل بنالیا تھا کہ وہ اپنی انوکھی، منفرد اور انتہائی ہلاکت آفریں ''تجارتی سلطنت'' کی بنیاد رکھ سکیں۔ اس کتاب میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ وہ کیوں اور کس طرح اس قابل ہوئے کہ آزادانہ طور پر قطعی خودمختار رہتے ہوئے اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ مختلف نوعیت کے چشم کشا انکشافات اور حیرت انگیز واقعات پر مبنی یہ کتاب ایک نیا زاویہ نگاہ پیش کرتی ہے جس کی مدد سے ایران کے موجودہ جوہری طالع آزماؤں کی کوششوں کو سمجھنا سہل ہوجاتا ہے اور یہ اندازہ بھی ہوجاتا ہے کہ ایران بہت ہی کم مدت میں ایٹم بم بنانے کے قابل ہوجائے گا۔ ان حقائق اور واقعات کے علاوہ گورڈن کوریرا کی اس کتاب میں ایسی چونکا دینے والی معلومات بھی دی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ

امریکی سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی۔ M16 نے کس طرح عبدالقدیر خان کے مذکورہ نیٹ ورک میں آہستہ آہستہ بڑی خاموشی کے ساتھ داخل ہوکر اپنے قدم جمالیے؟ کس طرح ان ایجنسیوں کی فراہم کردہ رپورٹوں پر عملدرآمد کرتے ہوئے امریکی اور برطانوی حکومتوں نے اس نیٹ ورک کو توڑنے اور اس زنجیر کے تمام حلقوں کو تباہ و برباد کرنے میں کیا کیا کردار ادا کیا؟ کس طرح پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کے علم میں تمام حقائق لاکر انھیں اس بات کے لیے قائل کیا گیا کہ وہ بہرصورت ملک کے قومی ہیرو کو فوری طور پر حراست میں لے لیں۔ مصنف کے دعویٰ کے مطابق اس کتاب میں پہلی بار تفصیلی طور سے یہ بتایا گیا ہے کہ لیبیا کے لیڈر معمر قذافی سے انتہائی تلخ ،کشیدہ اور تناؤ کے ماحول میں ہونے والی گفتگو کے دوران ایسے کیا معاملات طے ہوئے تھے جن کے نتیجے میں لیبیا نے فوری طور پر جوہری بم کی تیاری اور جوہری ہتھیاروں کے حصول کے پروگرام کو ترک کرنے کا اعلان کردیا۔ لیبیا کی جانب سے ایٹمی پروگرام اور جوہری ہتھیاروں کے حصول سے دست برداری کے اسی اعلان نے عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے زوال میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں جوہری ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ نے موجودہ عہد کو سلامتی کے عظیم ترین چیلنج سے دوچار کردیا ہے۔ چنانچہ اس کی تحریر کردہ یہ کتاب ایک ایسا دریچہ وا کرتی ہے جس میں سے آپ مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ دنیا بھر میں جاری جوہری اسلحے اور ہتھیاروں کے حصول کی اس دوڑ کو روکنا کتنا بڑا چیلنج ہے اور اس راہ میں کیا کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ یہ جوہری اسلحے کی وہ دوڑ ہے جسے آگے بڑھانے اور لے جانے میں پاکستانی سائنسدان عبدالقدیر خان نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

ٹارانٹو۔ اٹلی۔ ۴ر اکتوبر ۲۰۰۳ء

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ بحری جہاز جس کا نام ''بی بی سی۔ چائنا'' ہے

اپنے مقررہ پروگرام سے انحراف کر کے تارانتو، اٹلی کی بندرگاہ کی سمت رواں دواں ہے۔ یہ بندرگاہ اس کے مقرر کردہ بحری راستے میں شامل نہیں تھی لیکن اب اسے یہاں دو گھنٹے تک لنگر انداز ہونا پڑے گا۔ جرمن سیکرٹ سروس نے جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں اس بحری جہاز کے مالکان سے رابطہ کر کے مدد کی درخواست کی تھی، چنانچہ جہاز کے مالکان نے فوری طور پر جہاز کے کپتان سے ریڈیو پر رابطہ قائم کیا۔ جہاز اس وقت نہر سویز کی لہروں کے دوش پر خراماں خراماں گزر رہا ہے، اسے یہ ہدایت موصول ہوتی ہے کہ وہ فوری طور پر اپنا راستہ تبدیل کرلے!! ''کوئی سوال مت پوچھو.... جیسا کہا جا رہا ہے ویسا ہی کرو۔'' جہاز کے کپتان کو ہدایت دینے والے نے کہا۔ سرد رات کی یخ بستہ ہواؤں میں ٹھٹھرتے ہوئے اطالوی ملاح تارانتو میں اس بحری جہاز کی آمد کے منتظر ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ جو کام انھیں سونپا گیا ہے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اگر کوئی چیز ضروری ہے تو وہ ہے ''عجلت اور تیز رفتاری''.... انھیں بڑی پھرتی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ بحری جہاز ''بی بی سی-چائنا'' پر لدے دو سو سے زائد کنٹینرز میں سے انھیں چالیس چالیس فٹ لمبے کارگو کنٹینرز کی ان کے سیریل نمبروں سے شناخت کرنا ہوگی جو تعداد میں پانچ ہیں اور انھیں بقیہ کنٹینرز سے علیحدہ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد یہ بحری جہاز دوبارہ اپنے سمندری سفر پر روانہ ہو جائے گا۔ اس واقعے کو پوشیدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی تاکہ کسی کو بھی یہ پتا نہ چلنے پائے کہ اس بحری جہاز پر لدے ان پانچ مشکوک اور پراسرار کنٹینرز میں آخر کیا تھا؟؟؟ اس جہاز کی منزل مقصود لیبیا کی بندرگاہ طرابلس تھی۔

بحری جہاز ''بی بی سی-چائنا'' پر لادے گئے ان پانچ ہزار کنٹینرز کا سفر اگست ۲۰۰۳ء میں ملائیشیا کی ایک فیکٹری سے شروع ہوا تھا۔ امریکی سی آئی اے اور برٹش انٹیلی جنس کے مابین رابطے کے فرائض انجام دینے والی ایک ٹیم کو ستمبر کے وسط میں اطلاع موصول ہوئی تھی کہ اہم اشیاء اور سامان پر مشتمل ایک اسائنمنٹ دبئی کے فری ٹریڈ زون

میں اتارا گیا ہے جہاں اسے ایک بحری جہاز پر لادا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ جب تک اس ٹیم کو متعلقہ بحری جہاز کا پتا چلتا جس کا نام ''بی بی سی-چائنا'' تھا اور جس پر یہ سامان لدا ہوا تھا وہ بندرگاہ سے نکل چکا تھا، تاہم بڑی تلاش اور تفتیش کے بعد بالآخر اس جہاز کا پتا چل گیا جو اس وقت آہستہ آہستہ نہر سویز کی لہروں پر سے گزرتا اپنے سفر کی منازل طے کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ اس جہاز کی نشاندہی کے بعد اس کی انتہائی کڑی نگرانی شروع کر دی گئی اور آخر کار جہاز کے کپتان کو ہدایت کی گئی کہ وہ نہر سویز سے اٹلی کی بندرگاہ تارانتو پہنچ جائے۔ ادھر اطالوی بندرگاہ پر موجود سب ہی ملاح ان مشکوک اور پراسرار کنٹینرز کو کھولنے سے قبل ذہنی تناؤ کا شکار ہو چکے تھے۔ اگر ان کنٹینرز کو یہاں کھولا گیا اور ان میں سے صرف بچوں کے کھلونے برآمد ہوئے تو کیسی مضحکہ خیز صورتحال سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ امریکی سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے مابین رابطے کا کام کرنے والی ٹیم نے بڑی کدوکاوش کے بعد مذکورہ گمشدہ جہاز کو آخر کار تلاش کرہی لیا تھا.... گذشتہ کئی سال سے یہ ٹیم ایک ایسی تصویر کے مختلف اجزاء اور حصوں کو جوڑنے کی کوششوں میں مصروف تھی جس کا سلسلہ جوہری ٹیکنالوجی اور رازوں کی ایسی عالمی بلیک مارکیٹ سے تھا جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ تصویر اب تک کسی بھی طور مکمل نہ ہو سکی تھی۔ اس بلیک مارکیٹ سے انتہائی خطرناک نوعیت کی ہلاکت خیز اور تباہ کن جوہری ٹیکنالوجی دنیا کی بعض خطرناک ریاستوں کو فراہم کی جا رہی تھی۔ یہ ٹیم خدا جانے کب سے اس موقع کی تلاش میں تھی کہ اس عالمی نیٹ ورک کا سراغ لگا کر اسے پارہ پارہ کر سکے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس ٹیم نے کافی طویل عرصے تک انتظار اور نگرانی کی زحمت گوارا کی تھی۔ یہ سارا عمل بے حد سست رفتار، مشکل اور صبر آزما تھا۔ جوہری ٹیکنالوجی کے اس بین الاقوامی نیٹ ورک نے اسی عرصے کے دوران انتہائی

حساس مواد تیار کرلیا تھا اور اب اسے مزید گاہکوں کی تلاش تھی تاکہ اس کے عوض
غیر معمولی رقومات حاصل کی جاسکیں۔ بہرکیف ۲۰۰۳ء کے موسم بہار میں اس وقت ایک
سنہری موقع اس ٹیم کے ہاتھ لگ گیا جب برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی سے اس نیٹ ورک
کے ایک گاہک نے رابطہ کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس موضوع پر بات
چیت کرنا چاہتا ہے۔ لیبیا کی حکومت سے جوہری اسلحے کے سلسلے میں ہونے والے
مذاکرات کا سلسلہ ہنوز جاری تھا اور معمر قذافی نے یہ عندیہ بھی دیا تھا کہ وہ جوہری
ہتھیاروں کے حصول سے دست کش ہونے کو آمادہ ہیں تاہم اس نیٹ ورک میں داخل
کردہ امریکی اور برطانوی انٹیلی جنس کے افراد کی دی گئی اطلاعات کے نتیجے میں امریکی
اور برطانوی حکومت اس حقیقت سے باخبر تھی کہ لیبیا کے حکمران اتنے بھی دیانتدار نہیں
کہ اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر کردیں۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر
یہ موقع گنوا دیا جائے گا؟؟

لہٰذا اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ضروری تھا...... ٹارانٹو، اٹلی پہنچنے پر جب وہ پانچ مشکوک
اور پراسرار کنٹینرز کھولے گئے تو اطالوی ملاحوں کی ٹیم نے سکون اور اطمینان کا سانس لیا۔
ان کنٹینرز میں المونیم کے ہزاروں ایسے پرزے اور اجزائے تشکیلی موجود تھے جن میں
پورشنز، کیسنگ، پمپس اور فیلٹرز سب ہی کچھ شامل تھا۔ یہ سارا سامان لکڑی کے
صندوقوں میں بند ان کنٹینرز سے برآمد ہوا تھا، ان پر ''اسکوپ'' کا لوگو چسپاں تھا۔ صرف
ایک تربیت یافتہ ماہر ہی بتا سکتا تھا کہ یہ سامان اور اشیاء سینٹری فیوج کی تشکیل میں
استعمال کی جاتی ہیں۔ سینٹری فیوج کو جوہری پروگرام کا دل کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک
ایسا آلہ یا ذریعہ ہوتا ہے جسے یورینیم کو افزودہ کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔
افزودہ یورینیم ہی جوہری بم کی تیاری کا اہم ترین کلیدی عنصر ہوتا ہے۔

آیئے اب ذرا اس شخص کے بارے میں بھی کچھ جان لیں جس نے یہ تمام تر

معلومات اور صلاحیت فراہم کی تھی جس میں بی بی سی- چائنا پر لادے گئے یہ پانچ پراسرار
کنٹینرز بھی شامل تھے۔ یہ صحیح معنوں ایک اختتام کا آغاز تھا...... تمام تر ثبوت اور شواہد
ایک ہی فرد کی سمت اشارہ کر رہے تھے...... مزید تلاش و تحقیق اور جستجو کے بعد بالآخر
ثابت ہوگیا کہ جو معشوق اس پردہ زنگاری میں چھپا بیٹھا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ پاکستانی
جوہری سائنسدان، جاسوس اور قومی ہیرو ہیں جنھیں دنیا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نام سے
جانتی ہے جو گزشتہ کئی عشروں سے سیاہ ترین اور ہلاکت آفریں جوہری رازوں کی
فروخت میں ایک سیلز مین کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔

یہ ۸ر دسمبر ۱۹۵۳ء کا ذکر ہے جب سابق امریکی صدر آئزن ہاور اپنی اُس تقریر پر
بار بار نظر ثانی کر رہے تھے جس کی تیاری میں پہلے ہی کئی ماہ صرف ہو چکے تھے۔ انھیں
بخوبی علم تھا کہ یہ تقریر انھیں اقوامِ متحدہ کے روبرو کرنی ہے جسے ساڑھے تین ہزار سامعین
فوری طور پر اور براہِ راست سماعت کریں گے۔ آئزن ہاور کی تقریر کا بنیادی موضوع یہ تھا
کہ آنے والے عشروں کے دوران جوہری ٹیکنالوجی کے حصول کی جانب عالمی رویہ کیا
ہوگا؟؟ ہیروشیما اور ناگاساکی والے واقعات کے بعد آنے والے چند برسوں میں
جوہری ہتھیاروں پر امریکی اجارہ داری کا خاتمہ ہوتا جارہا تھا۔ دنیا کے زیادہ سے زیادہ
ممالک جوہری اسلحے اور ہتھیاروں کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے تاکہ بین الاقوامی
میدان میں انھیں طاقت، احترام اور سلامتی کا تحفظ حاصل ہوسکے۔ چنانچہ انتھک سائنسی
تحقیق، ریسرچ، ایٹمی جاسوسی اور بعض اوقات دیگر ممالک کی جانب سے دست تعاون
بھی اس ہلاکت آفریں صلاحیت کے حصول کو سہل بنانے میں نہایت اہم کردار ادا
کررہے تھے۔ جوہری ٹیکنالوجی کے بارے میں بنیادی علم اور معلومات اب دنیا کی
بیش تر ریاستوں کی دہلیز تک پہنچ رہی تھیں۔ امریکا اور روس کے مابین جاری سرد جنگ،
اسلحے کی دوڑ اور جوہری پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے کہا جارہا تھا کہ آنے والے برسوں میں یہ

دونوں چیزیں یعنی اسلحے کی دوڑ اور جوہری صلاحیت کا پھیلاؤ کسی بھی ملک کی قومی سلامتی کے لیے سنگین چیلنج ثابت ہوسکتا ہے، لہٰذا سابق امریکی صدر آئزن ہاور کی اس تقریر کا اصل مقصد بھی ایک عوامی مباحثہ شروع کرنا تھا کہ جوہری اسلحے کے پھیلاؤ کے اس سنگین خطرے کا سدباب کیسے کیا جائے۔ آئزن ہاور نے اپنی ڈائری میں یہ بھی لکھا تھا:

"میں بہت واضح طور پر اور صاف ذہن کے ساتھ اس بات کا تہہ دل سے قائل ہو چکا ہوں کہ ہماری موجودہ دنیا ایک ایسی دوڑ میں شریک ہے جو بلاشبہ قیامت خیز تباہی پر ہی ختم ہوگی۔"

آئزن ہاور نے اقوام متحدہ میں اپنی تقریر کو اس پیغام سے شروع کیا کہ امریکا کے پاس اسلحہ اور ہتھیار موجود ہیں، وہ دوسری عالمی جنگ کے دوران مجموعی طور پر استعمال کیے گئے تباہ کن اسلحے کے مقابلے میں اب بھی بہت زیادہ ہیں لیکن جوہری صلاحیت اور ایٹمی قوت کی تباہ کاریوں سے جو دہشت ناک پر اسراریت، ڈر اور خوف صرف امریکا ہی کو لاحق نہیں ہے بہت سے ممالک اور بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ انھیں خوف کے سایوں اور دہشت انگیزی کے اندھیروں سے باہر نکال کر روشنی اور اجالے میں لے آیا جائے۔ سپاہی کے ہاتھ سے ایٹمی اسلحہ چھین لینا ہی کافی نہیں ہوگا۔ یہ اسلحہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جنھیں اس بات کا بخوبی علم اور احساس ہے کہ اسے امن کے حصول اور استحکام کے قیام میں کیسے اور کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اقوام متحدہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ ایٹمی قوت اور جوہری توانائی جیسی تباہ کن اور ہلاکت خیز قوت کو بنی نوع انسان کی مجموعی فلاح و بہبود کے لیے کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس تخریب سے تعمیر کی صورت گری کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔ چنانچہ آئزن ہاور نے اقوام متحدہ میں اپنی اس تاریخی تقریر کے دوران یہ تجویز پیش کی تھی کہ جن ممالک کے پاس ایٹم بم موجود ہیں وہ فوری طور پر ان سے دستبردار ہو جائیں اور اپنا تمام ایٹمی اسلحہ ایک ایسے بینک میں جمع کرادیں جو بین

الاقوامی توانائی ایجنسی کی نگرانی میں کام کرتا ہو۔ اس طرح دنیا کے سبھی ممالک ایٹم بم کے پُرامن استعمال کے اثرات سے بہرہ ور ہوسکیں گے۔ اقوام متحدہ میں آئزن ہاور کی اس تاریخی تقریر کو سامعین کی جانب سے "ایٹم برائے امن" کے پیغام سے موسوم کیا گیا تھا۔

بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کا قیام ویسے تو ۱۹۵۷ء میں عمل میں آیا لیکن آئزن ہاور کا "ایٹم برائے امن" کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا لہٰذا جوں جوں جوہری ٹیکنالوجی کے حصول کی کوششوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا اسی نسبت سے امریکی صدر کا یہ خوشگوار خواب بھی بکھرتا چلا گیا۔ ۱۹۶۸ء کے دوران جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے کی رُو سے دنیا کی پانچ بڑی ایٹمی طاقتوں یعنی امریکا، روس، چین، فرانس اور برطانیہ کے مابین یہ سمجھوتا ہوا کہ وہ تخفیفِ اسلحہ کے بارے میں پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ مذاکرات کریں گی اور ان کی جانب سے دنیا کی تمام غیر ایٹمی قوموں کو یہ ضمانت دی جائے گی کہ سویلین جوہری پروگرام کے سلسلے میں اُن کی ہر ممکن مدد کی جائے گی بشرط یہ کہ وہ اپنے طور پر کسی بھی قسم کا ایٹمی، جوہری اسلحہ اور ہتھیار تیار نہ کریں۔

بہرصورت ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں ایٹم برائے امن کا یہ رجائی نظریہ دم توڑنے لگا۔ جوہری پھیلاؤ کا سلسلہ برابر آگے بڑھ رہا تھا حتیٰ کہ ۱۹۷۴ء آن پہنچا اور بھارت کی جانب سے ایٹمی دھماکے نے تمام امیدوں اور خوابوں کو چکنا چور کردیا۔ یقین اور اعتماد کا دامن تار تار ہو چکا تھا۔ ایٹم برائے امن کا نظریہ محض ایک خیال، ایک گمان بن کر رہ گیا۔ بھارتی ایٹمی دھماکے سے شہ پا کر دنیا کے سبھی ترقی پذیر ممالک جوہری اسلحے اور ہتھیاروں کی اس سیاہ ترین ٹیکنالوجی کے حصول میں کوشاں رہنے لگے۔ بھارت کے ایٹمی دھماکے نے نہ صرف امریکا کو ذلت اور تحقیر سے بداعتمادی کا زخم لگایا بلکہ ایٹم برائے امن کی مد میں دی جانے والی تمام امریکی امداد، مہارت اور مواد کو ایٹمی دھماکے کی غرض سے استعمال بھی کیا۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ پُرامن ایٹم اور تباہ کن ایٹم کو ایک

دوسرے سے علیحدہ اور الگ تھلگ نہیں رکھا جاسکتا کیوں کہ ایسا کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔ ان دونوں کے مابین گہرا تعلق ہے، لہٰذا ثابت ہوگیا کہ پُرامن سویلین مقاصد کے لیے جوہری ٹیکنالوجی اور معلومات کا پھیلاؤ ایٹم بم بنانے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن سکتا ہے۔

عبدالقدیر خان نیٹ ورک کا آغاز

ٹھیک یہی وہ لمحہ تھا جب عبدالقدیر خان عالمی اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ گذشتہ تین عشروں کے دوران جوہری ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کی داستان عبدالقدیر خان کے ذکر کے بغیر نامکمل اور ادھوری رہے گی۔ اس پوری کہانی پر اس شخص کے اثرات نہایت گہرے اور سایہ بہت دُور رس ہے۔ بھارت کے ایٹمی دھماکے کے ردِعمل میں پاکستان کے ایٹم بم کی تحقیق سے لے کر آج کے بین الاقوامی اور عالمی سلامتی وتحفظ کے عدم استحکام تک ڈاکٹر عبدالقدیر نے جوہری ٹیکنالوجی، رازوں اور ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے مختلف مراحل میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہی وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے آئزن ہاور کے ایٹم برائے امن کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے سے روکنے میں نہایت منفی اور تباہ کن کردار ادا کیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ امریکی سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر جارج ٹینٹ نے ان کے بارے میں ریمارکس دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان کسی بھی طرح اسامہ بن لادن سے کم خطرناک نہیں۔'' جارج ٹینٹ کا یہ تبصرہ ثابت کرتا ہے کہ عبدالقدیر خان نے دنیا بھر میں قیامِ امن کی جدوجہد کو سخت نقصان پہنچایا ہے جس کا بنیادی مقصد جوہری ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی سے وابستہ سنگین خطرات کو روکنا اور ان کا سدباب کرنا تھا۔ پوری دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں کے خطرے سے نجات دلانے کی جو عالمی کوششیں کی جارہی تھیں، ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انھیں ناکام بنادیا اور دنیا بھر میں جوہری توانائی کے پھیلاؤ کے لیے بدستور کام کرتے رہے۔ انھوں نے فقط پاکستان ہی کو جوہری صلاحیت سے بہرہ ور نہیں کیا بلکہ ایک ایسے عدیم

المثال اور انتہائی خطرناک جوہری نیٹ ورک کی بھی بنیاد رکھی جس نے موجودہ دنیا پر اپنے تباہ کن اور مہلک اثرات مرتب کیے ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک جوہری ٹیکنالوجی اور مہارت کے حصول کے خواہش مند ہیں کیونکہ جوہری ہتھیار غیر معمولی قوت، طاقت اور سلامتی کے تحفظ کی ضمانت دیتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انھیں اس ضمن میں بے شمار تکنیکی چیلنجوں کا سامنا رہتا ہے اور وہ جوہری ٹیکنالوجی کی ضروری صلاحیتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایسے تمام ممالک کی مشکل آسان کردی اور اپنے جوہری نیٹ ورک کے لیے موزوں گاہک تلاش کرتے رہے۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس پیچیدہ کہانی اور پُراسرار داستان کو منصفانہ انداز میں بیان کیا جائے تاہم امن کی کوششوں کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جو نقصان پہنچایا ہے، وہ ناقابل تلافی ہے اور اس کا صحیح اندازہ بھی شاید کبھی نہ ہوسکے گا۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جسے اُس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اس حقیقت کا ادراک نہ ہوجائے کہ بیش تر افراد کے لیے خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا پاکستان سے باہر ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک بہت بڑے ''ہیرو'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ پاکستانی ایٹم بم کا خالق ہونے کے ناتے پاکستانی قوم کا ایک بہت بڑا حصہ انھیں محسن قوم کا مرتبہ دیتا ہے۔

دہرے معیار اور دوغلا پن

بیش تر ترقی پذیر ممالک ان چند ممالک کو جو ایٹمی قوت اور صلاحیت کے حامل ہیں دوغلے پن اور دہرے معیار کا شکار قرار دیتے ہیں۔ وہ خود تو جوہری طاقت کے حامل ہیں لیکن دوسرے غیر ایٹمی ممالک کو اس صلاحیت سے محروم دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ نہ صرف ایٹمی قوت کے حامل ہیں بلکہ اس سے دست کش ہونے کو بھی تیار نہیں لیکن نہیں چاہتے کہ کسی دوسرے ملک کو بھی یہ صلاحیت حاصل ہوجائے۔ چنانچہ ناقدین اور نکتہ چینوں کا یہ کہنا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ایٹمی طاقت خود امریکا ہے جس نے خصوصی

طور سے دنیا بھر میں جوہری ہتھیاروں پر سخت ترین پابندیاں عائد کرنے کا خودساختہ ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ بہرکیف مغرب اور یورپی ممالک کے نزدیک، ایٹمی طاقت اور صلاحیت کا پھیلاؤ ایک بھیانک خواب کے مترادف ہے جس نے عالمی عدم تحفظ کے خطرات میں اضافہ کرتے ہوئے اس صلاحیت کے استعمال کو ممکن بنادیا ہے۔ تاہم حقیقت تو یہی ہے کہ کسی بھی قوم کو جسے اپنی سلامتی کا تحفظ درکار ہے اور جس کی سلامتی کے لیے متعدد سنگین خطرات بھی موجود ہیں؛ ایٹم بم کا حصول اس کے لیے ایک جائز اور فطری خواہش کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان اور پاکستانی قوم کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے تحفظ اور سلامتی کا یہ احساس دیتے ہوئے اس کی عزت اور احترام میں اضافہ کیا ہے۔ جس کی اس ترقی پذیر ملک کو شدت سے خواہش تھی لہٰذا اس کے عوض انھیں اپنی قوم میں ایک ''قومی ہیرو'' کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک اور حلقوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تاثر ایک پاگل اور جنونی شخص کا ہے جس نے عالمی امن کو انتہائی سنگین خطرات سے دوچار کردیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو مغرب کے اس رویے سے سخت نفرت ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ مجھے پاگل اور جنونی کہنا درحقیقت مغرب کے احساسِ محرومی کا نتیجہ ہے کیونکہ انھوں نے مغربی طاقتوں کے تمام منصوبوں کو یکسر ناکام بنانے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے جن کے ذریعے یہ مغربی ممالک پوری دنیا پر اپنی طاقت کا سکہ جمانا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیگر لوگوں نے بھی جوہری عدم پھیلاؤ کی کسی حد تک خلاف ورزی کی ہے لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان وہ واحد اور پہلے شخص ہیں جن پر یہ الزام لگا کہ انھوں نے جوہری عدم پھیلاؤ کے پورے نظام ہی کو تباہی اور بربادی سے دوچار کردیا ہے۔ دنیا کے متعدد ممالک جو ایٹمی طاقت ہیں ایٹمی جاسوسی میں بھی ملوث رہے ہیں۔ ان میں سے بیش تر نے جوہری ٹیکنالوجی کو پھیلایا بھی ہے جو ان کی اسٹریٹجک ترجیحات کے عین مطابق تھا۔ مثال کے طور پر امریکا نے برطانیہ کو، فرانس نے اسرائیل

کو، سوویت یونین نے چین کو اور چین نے پاکستان کو جوہری ٹیکنالوجی اور معلومات فراہم کی ہیں لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا معاملہ کافی مختلف ہے، وہ تو ہر اس ملک کو ٹیکنالوجی فروخت کرنے پر آمادہ تھے جو انھیں اس کے عوض معاوضہ ادا کرسکتا ہو۔ ایسے ممالک میں ایران، شمالی کوریا اور لیبیا بھی شامل ہیں۔ چناں چہ جوہری ٹیکنالوجی کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ انتہائی ہلاکت خیز اور خطرناک ہتھیاروں کے انبار نجی شعبے میں بھی دستیاب ہونے لگے جن پر کسی بھی ریاست یا حکومت کا قطعاً کوئی کنٹرول نہ تھا۔ گویا نجی شعبے میں جوہری ہتھیاروں اور اسلحے کی منڈی کھل گئی تھی۔

ان تمام حقائق اور واقعات سے آپ قطعاً یہ نہ سمجھیں کہ عبدالقدیر خان کی کہانی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وہ کوئی تنہا ولن، کامِک کا کوئی کردار، یا کسی جاسوسی فلم کے لیے کام نہیں کررہے تھے۔ وہ فی الواقع جوہری ٹیکنالوجی، معلومات اور رازوں کا ایک فعال نیٹ ورک چلا رہے تھے۔ اس پورے نیٹ ورک میں وہ بیچ کے آدمی کا کردار ادا کررہے تھے، انھیں آپ بروکر یا مڈل مین بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایسی ریاستوں کو جوہری ٹیکنالوجی فروخت کرنے میں ہمیشہ ایک بروکر کا کردار ادا کرتے رہے جو یہ ٹیکنالوجی خریدنے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ جوہری ٹیکنالوجی کی ہمہ جہت اہمیت اور ہمہ گیر ضرورت کے پیشِ نظر انھوں نے ایک طرح کی تجارتی اور کاروباری حرص اور طمع کو جنم دیا تھا۔ اگر آپ اس تناظر میں ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو ایسا انوکھا اور منفرد دریچہ نظر آئے گا جس کے ذریعے ایسی پراسرار اور مشکوک دنیا آپ کے سامنے آئے گی جس میں قوموں کا ایک مختصر سا گروہ مل کر باہمی اشتراک اور تعاون سے پوری دنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے اور ترقی یافتہ میزائل نیوکلیئر ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دے گا۔ یہ ایک ایسی خطرناک ٹیکنالوجی اور عالمی تجارت کی ایسی بنیاد ہے جو ہمیشہ اپنے بانی اور خالق کے نام سے جانی اور پہچانی جائے گی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ان سرگرمیوں میں کیوں اور کیسے ملوث ہو گئے؟ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بسا اوقات پاکستان ہی کا ایک ایجنٹ سمجھا جاتا ہے یا پھر کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا اُن سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے طور پر یہ سرگرمیاں جاری رکھی ہیں۔ بہر نوع ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جوہری ٹیکنالوجی کے ضمن میں آج تک جتنے بھی سودے کیے وہ سب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اسے سمجھنا بے حد ضروری ہے تاکہ ان کی سرگرمیوں کے حوالے سے پوچھے جانے والے سوالات کا جواب تلاش کیا جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی حکومت اور انتظامیہ کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ان تمام سرگرمیوں کا علم تھا؟ اگر تھا تو کس قدر تھا۔

بہر حال ان سوالات کا جواب اتنا آسان اور سہل بھی نہیں ہے!! تاہم پاکستان اور پاکستانی حکومت کے لیے ان میں سے ہر سوال کا جواب ناخوشگوار اور غیر اطمینان بخش ہی ہوگا یا تو حکومت کو سرے سے ان کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور اپنے بے حد حساس، قومی سلامتی کے پروگرام پر اسے قطعاً کوئی کنٹرول حاصل نہیں تھا یا پھر وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی تمام سرگرمیوں اور حرکات سے مکمل طور پر باخبر تھی لیکن انھیں روکنا اس کے بس میں نہ تھا۔ بہر طور ان میں سے کوئی بھی جواب اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہوگا کہ جوہری بم کو زیادہ سے زیادہ ممالک تک پہنچانا اب کتنا آسان ہو چکا ہے۔ انھی سوالات کے ساتھ یہ سوال بھی ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ اگر انھوں نے جوہری پھیلاؤ کے ذریعے عالمی امن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو انھیں اس سے باز رکھنے اور روکنے کے لیے اقدام کیوں روبہ عمل نہیں لایا گیا؟ آپ اس معاملے کو انٹیلی جنس کی ناکامی کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے کیوں کہ ان کی تمام سرگرمیاں اور نیٹ ورک کی موجودگی دنیا کے لیے ہرگز کوئی سربستہ راز نہ تھی۔ مغرب کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو تو کئی عشروں سے اس کا

علم تھا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ انٹیلی جنس بجائے خود کافی نہیں ہوتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ اسے کس طرح بروئے کار لاتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جو کچھ بھی کر رہے تھے، اسے بے نقاب کیا جاتا بلکہ اس کے برعکس اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان کی سرگرمیوں کو مزید آگے بڑھنے سے روکنے کی غرض سے ان کے خلاف قدم اٹھایا جاتا۔ اس حوالے سے جو ناکامی ہوئی ہے وہ درحقیقت پالیسی اور سیاسی عزم کی ناکامی ہے جس میں پاکستان کے ساتھ امریکا کے عجیب و غریب تعلقات اور انٹیلی جنس کا بھی خاصا دخل ہے جس کی بنا پر طویل عرصے تک مغرب کو لاعلم اور گمراہ رکھا گیا۔

اس کتاب کے دوسرے نصف حصے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عبدالقدیر خان کے جوہری پھیلاؤ کے نیٹ ورک کو بالآخر انٹیلی جنس اور ڈپلومیسی کے مختلف حربوں اور ہتھکنڈوں کے ذریعے کیسے توڑا گیا؟ انھوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ نقصان پہنچایا وہ یقیناً ناقابل تلافی تھا لیکن یہ ہرگز مت بھولیے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ اور بڑا نقصان بھی پہنچا سکتے تھے لیکن دیر آید درست آید کے مصداق انھیں اس سے قبل ہی روک دیا گیا تھا۔ اس کامیابی کے باوجود جوہری عدم پھیلاؤ کا پروگرام آج بھی عدم تحفظ کا شکار ہے۔ آج بھی ۱۹۷۰ء کے وسط کی طرح دنیا کو پھر اسی خطرے کا سامنا ہے۔ ایران اور شمالی کوریا جیسے ممالک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے گاہک رہ چکے ہیں، لہٰذا اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے جوہری پھیلاؤ کے مزید امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص نائن الیون کے بعد آنے والے دور میں جب عدم تحفظ، عدم سلامتی کے احساسات کو مغرب کی پالیسیوں کے نتیجے میں زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ مزید ممالک اس ٹیکنالوجی میں زیادہ فروغ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی تو وہ ہوا کا رخ دیکھنے میں مشغول ہیں۔ ایران کی جوہری طالع آزمائی نے عدم پھیلاؤ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ ایران کے معاملے میں خواہ کوئی کچھ بھی کہے لیکن عبدالقدیر خان کی کہانی سے جن

بے شمار مسائل کا انکشاف ہوا ہے ان سے پوری دنیا آگاہ ہے۔ چنانچہ آئزن ہاور سے لے کر آج تک یہ مسئلہ دنیا کے سامنے موجود رہا ہے کہ جوہری ٹیکنالوجی کو بجلی پیدا کرنے کے علاوہ جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، لہٰذا آج کی دنیا میں ٹرانس نیشنل نیٹ ورکس، بین الاقوامی دہشت گردی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی جوہری ٹیکنالوجی کو دیکھتے ہوئے جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا بے حد اہم لیکن ساتھ ہی انتہائی مشکل ہو چکا ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سوانح عمری نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں اُن کے نیٹ ورک کی تکنیکی خصوصیات کی کوئی تاریخ ہی بیان کی گئی ہے۔ اس کے برعکس یہ ان تمام سوالات کی وضاحت کی ایک کوشش ہے جن کا تعلق ایک وسیع تر تناظر سے ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ آخر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے وہ سب کچھ کیوں کیا جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ انھیں روکا کیوں نہ گیا؟ جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے میں آخر کون سی پیچیدگیاں اور رکاوٹیں حائل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی داستان کو الگ تھلگ رکھ کر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ پاکستان میں انھیں کیا مرتبہ اور مقام حاصل تھا۔ پاکستان کے جوہری پروگرام سے ان کا کیا تعلق تھا۔ اپنے وسیع تر تجارتی نیٹ ورک اور وسیع تر اسٹریٹجک تناظر سے ان کا تعلق کس نوعیت کا تھا۔

"جڑ بنیاد" سقوطِ مشرقی پاکستان

ڈھاکا کے رمنا ریس کورس گراؤنڈ پر شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ فتح مند اور کامران بھارتی فوجی دستے جوق در جوق کامیابی کے نشے میں چور، رمنا گرین کی جانب رواں دواں تھے۔ بھارتی افواج ڈھاکا شہر میں اپنی فتح کا جشن منا رہی تھیں۔ پورا شہر توپوں کی گھن گرج سے گونج رہا تھا۔ یہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کا دن تھا۔ پاکستانی افواج اور حکومت کے لیے تاریخ کا انتہائی سیاہ ترین دن، ۱۳ دنوں کے اندر اندر بھارتی فوجوں

نے پاکستان کی افواج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے پاکستانی افواج کے ایسٹرن کمانڈر کے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی جنھیں عرف عام میں "ٹائیگر نیازی" کہا جاتا تھا بے حد پُراعتماد اور دبنگ آدمی خیال کیے جاتے تھے اور انھیں اپنی ذات پر غیر معمولی اعتماد تھا۔ یہی وہ ٹائیگر نیازی ہیں جو یہ دعوے کرتے نہیں تھکتے تھے کہ وہ اپنے آخری جوان تک بھارتی افواج کا مقابلہ کریں گے۔ انھوں نے سقوط ڈھاکا سے صرف چند دن قبل ہی مغربی پاکستانیوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ بھارتی فوجیں ان کی لاش پر سے گزر کر ہی ڈھاکا میں داخل ہو سکتی ہیں لیکن اس شام بے حد سہمے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر شکست خوردگی کے تمام تر تاثرات موجود تھے۔ وہ رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں کھڑے بھارتی کمانڈر کے رُوبرو ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ لکڑی کے بنے ایک ڈیسک پر بیٹھے جنرل نیازی نے حسب معمول اپنی چھڑی، گول ٹوپی سر پر سجا رکھی تھی جو اب ان کا مخصوص ٹریڈ مارک بن چکی تھی۔ آنسو بس ان کی آنکھوں سے چھلکنے ہی والے تھے، وہ انھیں روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ بھارتی فوجی افسران نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ان افسران کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہتھیار ڈالنے کی ٹائپ شدہ دستاویز پر اپنے دستخط کرنے کے بعد جنرل ٹائیگر نیازی فوری طور پر کھڑے ہوئے۔ بھارتی فوجی افسران سے ہاتھ ملایا۔ اپنی کمر کا پٹا کھول کر اس میں سے سروس ریوالور باہر نکالا اور اسے ایسٹرن کمانڈر کے بھارتی جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سپرد کر دیا، جیسے ہی اس پوری کارروائی کے بعد جنرل نیازی اپنی مخصوص فوجی جیپ میں بیٹھ کر رمنا ریس کورس گراؤنڈ سے رخصت ہوئے وہاں موجود لوگوں کے جم غفیر نے جنرل اروڑہ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کا عظیم ترین سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ اب وہ بنگلہ دیش کے نئے نام سے پکارا جائے گا۔ ڈھاکا شہر کو اس نئی مملکت بنگلہ دیش کا

صدر مقام بنایا جائے گا۔ بنگلہ دیش کی نئی آزاد اور خودمختار مملکت!!! مشرقی پاکستان کے عوام بھارت کی بھرپور تائید و حمایت کا سہارا لے کر مغربی پاکستان کے غیر مساویانہ سلوک اور افواج کے سفاکانہ مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پاکستان کا ایک بازو علیحدہ ہو چکا تھا اور دوسرے کی بقاء خطرے میں پڑ چکی تھی۔ اسی اثناء میں خبریں گردش کرنے لگیں کہ امریکا کا ساتواں بحری بیڑہ مشرقی پاکستان کو بچانے کے لیے جلدی پہنچ رہا ہے لیکن یہ سب افواہیں تھیں۔ گرم افواہیں جن کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ پاکستان کا کوئی بھی دوست، حلیف اور اتحادی اس کی بروقت مدد کو نہ پہنچا۔ رمنا ریس کورس گراؤنڈ سے براہ راست دکھائی جانے والی ٹیلی فلم میں پاکستانی افواج کو اپنے دیرینہ حریف بھارت کی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے دکھایا گیا تھا۔ پاکستان کی شکست کے یہ شرمناک مظاہر مغربی پاکستان میں فقط ایک ہی بار دکھائے جا سکے۔ کراچی ٹیلی وژن اور ملک کے دوسرے اسٹیشنوں پر یہ مظاہر دیکھتے ہی احتجاج اور ناراضگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستانی مسلح افواج کے ذہن میں بھی یہ شبہ گردش کرنے لگا کہ ''پاکستانی افواج کو مزید ذلت اور رسوائی کا نشانہ بنانے کی غرض سے یہ تمام مناظر ٹیلی وژن پر دکھائے جا رہے ہیں۔

پاکستان سے ۳۵۰۰ میل دور بیٹھا پاکستانی

مغربی پاکستان میں اس ٹیلی فلم پر ہمیشہ کے لیے پابندی عائد کر دی گئی لیکن اس دن پاکستان سے ۳۵۰۰ میل دور یورپ کے ایک شہر میں ان مناظر کو دیکھنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ یورپ کے ملک بیلجیم کے شہر میں مقیم ایک پاکستانی طالب علم نے جو اپنی ڈاکٹریٹ کی سند کے حصول کا منتظر تھا اپنی قوم کی شکست کے یہ تمام مناظر کھلی آنکھوں سے دیکھے۔ وہ ان سارے مناظر کو دیکھ کر انتہائی آزردہ، غمگین اور خوف کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ غیر یقینی اور ڈپریشن کا غلبہ اس کے سارے وجود پر ہونے لگا۔ اس واقعہ کا اس پاکستانی طالب علم نے اتنا گہرا اور شدید اثر قبول کیا کہ اب وہ ایک سیکنڈ

کے لیے بھی وہاں رکنے اور کام کو جاری رکھنے کا خواہش مند نہ تھا۔ اپنی قوم کی رسوا کن شکست کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غصے اور اشتعال نے اس کے اندر ایک فیصلہ کن عزم اور آہنی ارادے کو جنم دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک وہ زندہ ہے ایسی قیامت آثار تباہی سے اپنی قوم کو ہرگز دوچار نہ ہونے دے گا۔ وہ ایسی قیامت خیز تباہی کو روکنے کے لیے اپنی تمام ممکنہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا۔ کیا آپ جانتے ہیں بیلجیم میں ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا مقالہ تحریر کرنے والا یہ طالب علم کون تھا؟؟؟

قوم پرستی کا جوالا مکھی

یہ نوجوان طالب علم پاکستان کا ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان تھا۔ یورپ میں وہ جاسوسی کرنے نہیں آیا تھا۔ اس کے برعکس، امنگوں، آرزوؤں اور امیدوں سے سرشار یہ نوجوان ایک طالب علم کی حیثیت سے یورپ میں وارد ہوا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ جوہری ٹیکنالوجی کی کرشماتی فتوحات کو ایک کھلے، سائنسی تبادلے کے کلچر کی حیثیت میں پوری دنیا تک پھیلایا جا سکتا ہے لیکن ابھی اس کا یہ یقین محض گمان تھا۔ اسے حقیقی شکل دیے جانے میں کچھ عرصہ ابھی باقی تھا۔ جوہری ٹیکنالوجی کے تبادلے سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو غیر معمولی فائدے پہنچنے والے تھے، جب انھوں نے اپنے تعلیمی کیریئر کو ختم کر کے عملی اور پیشہ ورانہ زندگی میں قدم رکھا تو ان کے ساتھ کام کرنے والے مغربی دوستوں اور ساتھیوں نے محسوس کیا کہ ایک ایسا پاکستانی نوجوان سائنس دان ان کے ساتھ کام کر رہا ہے جس نے مشکل اور رکاوٹ کے بغیر خود کو مغربی ماحول، کلچر اور تہذیب کے سانچے میں ڈھال کر لمحہ موجود کے بین الاقوامی رجحانات سے پوری طرح ہم آہنگ کر لیا ہے۔ تاہم ان کے وجود کے اندر کون سے طوفان پروان چڑھ رہے ہیں اس کا اندازہ فقط ان کے چند ساتھیوں ہی کو تھا جو بخوبی اس حقیقت کو جان چکے تھے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بظاہر پرسکون، خاموش، مطمئن اور حس مزاح سے بھرپور وجود کے

باطن کی تہہ میں قوم پرستی کا کتنا بڑا طوفان موج زن ہے جو موقع ملتے ہی باہر نکل آنے کا منتظر ہے۔ قوم پرستی کا یہ جوالا مکھی ہر آن، ہر لمحہ ان کے وجود کی گہرائیوں میں دہک رہا تھا۔

۱۹۴۷ء کی ہجرت کے سانحات

پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کے شہر بھوپال میں پیدا ہوئے جو بھارت کی ایک سابق ریاست ہے۔ ان کی پیدائش کے تقریباً دس برس بعد ہی ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء کی اس تقسیم کے نتیجے میں ہولناک، قیامت خیز فسادات ہوئے اور لاکھوں کی تعداد میں مسلمان، ہندو اور سکھ نذرِ اجل ہوگئے۔ ہندوستان تقسیم ہوا تو ان کی عمر گیارہ برس تھی۔ کم سنی کے باوجود تقسیم کے بعد ہونے والے فسادات کی تلخ یادیں اور گہرے زخم ان کے حافظے کا حصہ بنے رہے۔ ان تلخ یادوں کو وہ آج تک فراموش نہیں کر پائے۔ انھیں بخوبی یاد ہے کہ مسلمانوں کی لاشوں سے پٹی ٹرینیں اسٹیشن پر آیا کرتی تھیں۔ بلوؤں میں شریک فسادی پوری ٹرین کاٹ دیا کرتے تھے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا خون ارزانی کے ساتھ بہایا گیا۔ بھارت سے مہاجرین کو لے کر آنے والی آخری ٹرین کی فریم شدہ تصویر ان کے اسلام آباد والے گھر کی اسٹڈی میں آج بھی لگی ہوگی۔

ہندوستان پاکستان میں آمد

۱۹۵۲ء میں وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ بھارت میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے چنانچہ انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ بھی اپنے بھائیوں کے پاس پاکستان چلے جائیں گے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ بذریعہ ٹرین پاکستان کے لیے روانہ ہوگئے۔ ٹرین کا سفر خوف و ہراس اور تشدد کے مناظر سے بھرپور تھا۔ اس سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات ان کے حافظے میں سالوں موجود رہے۔ ایک اسٹیشن پر بھارتی پولیس والے نے

ایک مسلمان عورت کے زیورات چھین کر اس کے کانوں میں لگے بندے نوچ لیے۔ مسلمان مسافروں سے ان کا تمام قیمتی مال و اسباب بھی چھین لیا گیا۔ بھارت کے غیر مسلم ٹکٹ چیکر مسافروں سے ان کے ٹکٹ لے کر اس وقت تک انھیں واپس نہیں کرتے تھے جب تک انھیں تھوڑی بہت بخشش نہ دے دی جاتی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پاس ایک فاؤنٹین پین تھا جو ان کے بڑے بھائی نے انھیں امتحان پاس کرنے کی خوشی میں دیا تھا۔ جب ٹرین بھارتی سرحد پار کرنے لگی تو ایک سرحدی گارڈ ان کی سمت بڑھا اور ان کی جیب سے وہ یادگار قلم نکال لیا۔ وہ قلم اتنا قیمتی تو نہ تھا لیکن اس گارڈ کے رویے سے انھیں بے حد تکلیف پہنچی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانگی

پاکستان میں ثانوی تعلیم کے مدارج طے کرنے کے بعد وہ بالآخر کراچی یونیورسٹی میں داخل ہوگئے۔ وہ ابتداء ہی سے ایک محنتی طالب تھے۔ ان کے والد شہر کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ اسی دوران عبدالقدیر خان نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یورپ سے واپس آکر وہ پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں پڑھائیں گے!!! یہی کچھ سوچ کر وہ بالآخر یورپ کے لیے روانہ ہوگئے۔ پہلے پہل تو گھر اور افرادِ خاندان کی یادوں نے انھیں بہت ستایا۔ وطن کی یاد میں وہ کچھ دنوں تک تو بے تاب اور مضطرب رہے لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے خود کو نئے ماحول، نئی فضا اور نئے لوگوں سے ہم آہنگ کرلیا۔ یورپ میں وہ مجموعی طور پر دس برس تک مقیم رہے۔ پہلے وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مغربی برلن گئے، وہاں سے بعد میں ہالینڈ اور پھر آخر میں بیلجیم چلے گئے جہاں سے انھوں نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ان تمام سالوں کے دوران انھوں نے نہ صرف غیر معمولی سائنسی مہارت اور صلاحیت بہم

پہنچائی بلکہ اپنے گردوپیش ساتھیوں، دوستوں اور احباب کا ایسا حلقہ بھی جمع کرلیا جو ایک خوش مزاج نوجوان پاکستانی سائنس دان کی مدد کرنے کو ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ ان دوستوں میں سے بعض نے تو اس وقت بھی ان کی مدد کی جب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی خواہشات نے ایک نیا رُخ اور نئی سمت اختیار کرلی تھی۔ اُس دور میں جو لوگ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نزدیک رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ ایک خوش مزاج اور جلد گھل مل جانے والے نوجوان تھے جو لوگوں سے بہت جلد دوستی کے تعلقات استوار کرلیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جن دنوں ڈیلفٹ، نیدر لینڈ کی یونیورسٹی میں زیرِتعلیم تھے تو ان کی بڑی گہری دوستی سیلیوس سے ہوگئی۔ ان دونوں کے مکانات بھی برابر برابر تھے۔ ہینک سیلیوس کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک سنجیدہ اور بُردبار طالب علم تھے۔ ان دونوں کے مابین یہ دوستی آگے چل کر اتنی گہری ہوگئی کہ سیلیوس ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے کام میں ان کا اہم ترین معاون بن گیا۔

جوہری پھیلاؤ میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا اہم کردار

گذشتہ تین عشروں کے دوران دنیا بھر میں جوہری پھیلاؤ کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا انفرادی کردار اور ان کے اثرات سب سے زیادہ رہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی جس کے بعد انھیں ایک ایسے کام کی پیشکش ہوئی جو ان کی خصوصی صلاحیتوں کے عین مطابق تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جوہری سائنسدان کی حیثیت سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ڈاکٹر خان درحقیقت Metallurgy کے طالب علم تھے چنانچہ انھیں جوہری سائنسدان کہنے کے بجائے Metallurgist کہنا ٹھیک ہوگا۔ پروفیسر ایم جے برجرز جن کی نگرانی میں انھوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا تھا انھیں یہ معلوم ہوا کہ فزیکل ڈائنامکس ریسرچ لیبارٹری، نیدرلینڈ میں ایک اچھی اسامی خالی ہے۔ چنانچہ

انھوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس کی پیش کش کردی۔ اگر انھیں ملازمت کی یہ پیش کش نہ ہوئی ہوتی تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان صرف اور محض ایک انجینئر یا معلم کی حیثیت سے گمنام زندگی گزار رہے ہوتے۔ اپنے پروفیسر کی سفارش کے نتیجے میں وہ انٹرویو میں پیش ہوئے اور مئی ۱۹۷۲ء سے وہاں اپنا کام شروع کردیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ریسرچ لیبارٹری انتہائی جدید ترین اور نئی جوہری ٹیکنالوجی متعارف کرانے والی تھی۔ اس ریسرچ لیبارٹری کا سلسلہ وار تعلق Urenco کے ڈچ ونگ سے تھا۔ یورینکو ایک بین الاقوامی کنسورشیم تھا جس کا قیام ۱۹۷۱ء میں عمل میں آیا تھا۔ برطانیہ، جرمنی اور نیدر لینڈ اس کنسورشیم کے رکن ممالک تھے جس کا شمار یورپ کے ان اداروں میں ہوتا ہے جو جوہری ایندھن کے لیے انتہائی جدید ترین اور ترقی یافتہ سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کے حصول کی غرض سے کوشاں تھا۔ یہ وہ دور تھا جب جوہری توانائی کو سستی اور بڑی مقدار میں ایندھن اور بجلی کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ یورپ کی خواہش تھی کہ وہ امریکا پر انحصار ختم کرکے افزودہ یورینم کی پیداوار اور فراہمی کے سلسلے میں خودکفیل ہوجائے۔

یورینکو میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شمولیت اور مخصوص کام کی نوعیت

یورینکو نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی خدمات کو ایک خاص سبب سے مستعار لیا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ یورینکو ایک نئے جرمن ڈیزائن کے سینٹری فیوج ماڈل کی تیاری میں کوشاں تھی جس کے لیے بے شمار دستاویزات اور کاغذات کے ترجمے کی ضرورت تھی، چنانچہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اس نئی ملازمت کا مقصد ان سے بیک وقت ایک سائنس دان اور ایک مترجم کا کام لینا تھا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو انگریزی، ولندیزی اور جرمن زبان پر مکمل عبور حاصل ہوچکا تھا۔ دوسری جانب انھیں Metallurgist کی حیثیت سے اپنے کام میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ اپنی نئی ملازمت کا آغاز کرنے سے قبل ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ڈچ سیکیورٹی سروس سے سیکیورٹی

کلیئرنس حاصل کرنا تھی کیونکہ یورینکو کا کنسورشیم اسی سیکیورٹی سروس کے زیرنگرانی تھا۔ بہرکیف اس سلسلے میں انھیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ سیکیورٹی کلیئرنس دینے والے اہلکاروں کو اس نوجوان سائنس دان سے بظاہر کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا جس کا تعلق ایک غریب، ترقی پذیر اور پسماندہ ملک پاکستان سے تھا اور جو گذشتہ دس برس سے یورپ میں رہائش پذیر تھا۔ یہ سیکیورٹی والوں کا لچک دار رویہ ہی تھا جو آگے چل کر یورینکو اور نیدرلینڈز کی حکومت دونوں کے لیے ایک بڑی آزمائش بن گیا۔ یورینکو نے ڈاکٹر خان کو اہم ترین دستاویزات کے ترجمے کا جو کام سونپا تھا اس کے ذریعے حساس نوعیت کی معلومات کا حصول ان کے لیے بے حد سہل اور آسان ہوتا چلا گیا۔ وہ اختتام ہفتہ پر یہ ساری دستاویزات اپنے ہمراہ گھر لے جایا کرتے تھے۔ انھیں اس بات کی کلیئرنس دی گئی تھی کہ وہ صرف اور محض وہی مواد ترجمہ کرسکتے ہیں جس پر Restricted کا لفظ تحریر ہو۔ چنانچہ وہ ایسی کسی حساس دستاویز کو نہیں دیکھ سکتے تھے جس پر Confidential یا Top Secret لکھا ہو!! ان پابندیوں کے باوجود وہ اس نوعیت کی حساس دستاویزات تک بھی پہنچ گئے جنھیں دیکھنے اور پڑھنے پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔ ان دستاویزات سے انھیں بیش قیمت اور حساس نوعیت کی معلومات بہم پہنچیں۔ کام کاج کے لیے انھیں ایک چھوٹا سا دفتر دیا گیا تھا اور انھیں صرف بڑے پلانٹ میں داخلے کی اجازت حاصل تھی اور وہ بھی کسی نگران شخص کے ہمراہ!!! تاہم اس وقت وہاں کام کرنے والے اسٹاف ممبران نے بتایا کہ اپنا کام شروع کرتے ہی ڈاکٹر خان نے خفیہ سینٹری فیوج پلانٹ کے اندر بھی جانا شروع کردیا تھا تاکہ اس خفیہ ٹیکنالوجی کے بارے میں تمام تر اندرونی معلومات حاصل کرسکیں۔ یورینکو میں کام کرنے والا اسٹاف جرمنی سے کلاسیفائیڈ ڈیزائن، ڈرائنگز اور دیگر اہم تحریری مواد لے کر نئے سینٹری فیوج کی تیاری کے لیے اسے سفارتی سامان کی حیثیت سے لایا کرتا تھا جسے ڈاکٹر عبدالقدیر خان ترجمہ کرتے اور

انجینئرنگ کی ضروریات کے مطابق مسودہ کو تیار کرتے۔ ڈاکٹر خان اپنی نوٹ بک ہاتھ میں لیے ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے لیکن کسی نے بھی ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ ایک دن ان کے ایک ساتھی نے دیکھا کہ وہ اپنی مادری زبان یعنی اردو میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ ذاتی نوعیت کا خط لکھ رہے ہیں جس پر ان کے ساتھی نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ ڈچ حکومت کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور دیگر تمام لوگ وہاں کھلے ماحول میں کام کرتے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر خان کا اصل شعبہ مختلف تھا لیکن انھیں دیگر نوعیت کی متنوع اور وسیع معلومات حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ صرف یہی جاننا نہیں چاہتے تھے کہ سینٹری فیوج کس طرح اور کیسے کام کرتا ہے بلکہ انھیں یہ جاننے میں بھی گہری دلچسپی تھی کہ سینٹری فیوج کو جوڑا کیسے جاتا ہے اور اس کے پرزے کون فراہم کرتا ہے؟؟؟ زوانیمبر گ کے خاموش مضافاتی علاقے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان معمولی زندگی بسر کررہے تھے۔ ۱۹۶۳ء کے دوران پوسٹ آفس میں ان کی ملاقات ہینڈرینا نامی خاتون سے ہوئی جو ایک خاموش طبع، کم گو اور مخلص جنوبی افریقہ نژاد ڈچ خاتون تھیں۔ ان دونوں نے دی ہیگ کے پاکستانی سفارت خانے میں شادی کرلی تھی اور ان دونوں میں ایک نوجوان ازدواجی جوڑے کی باہمی محبت اور یگانگت کی تمام تر خوبیاں نمایاں تھیں۔ دونوں ہمہ وقت ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھوں میں تھامے نظر آیا کرتے تھے۔ یورینکو میں ڈاکٹر خان کے ساتھ کام کرنے والے شخص فریٹس ویرمین کا کہنا ہے کہ وہ ایک دوستانہ شخصیت کے مالک تھے اور اپنے ہمراہ کام کرنے والے افراد کی ذات میں گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات وہ اپنے ساتھیوں کے لیے مٹھائی وغیرہ بھی لے کر آیا کرتے تھے۔ فریٹس ویرمین اور ڈاکٹر خان کے مابین دوستانہ تعلقات یہاں تک بڑھے کہ ویرمین عموماً رات کا کھانا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ہمراہ ان کے گھر پر کھایا کرتے تھے۔ وہ یورپین کھانوں کی نسبت

پاکستانی کھانے زیادہ شوق سے کھایا کرتے تھے۔ یہیں ویرمین، ڈاکٹر خان کی اہلیہ ہنڈریکا اور ان کی دونوں صاحبزادیوں دینا اور عائشہ سے بھی متعارف ہوئے۔ فریٹز ویرمین ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک دوہری شخصیت کے مالک ہیں اور ان کا اصل کام اور دلچسپی کسی اور مقصد سے وابستہ ہے۔ درحقیقت وہ دوہری زندگی بسر کررہے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے نام ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تاریخی مکتوب

۱۹۷۴ء کے موسم خزاں تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر اپنی مشکوک، مشتبہ اور پُراسرار سرگرمیوں کے نتیجے میں ایک جاسوس کا شبہ ہونے لگا تھا۔ تاہم اس بات کے کوئی شواہد دستیاب نہ ہوسکے کہ انھیں جاسوسی کے لیے باقاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ اصل قصہ یہ تو کہ ۱۹۷۱ء میں بھارتی افواج کے ہاتھوں پاکستان کی رسواکن اور ذلت آمیز شکست کے نتیجے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا قومی پندار سخت مجروح ہوا تھا اور ان کے جذبہ قوم پرستی کو انتہائی شدید صدمہ پہنچا تھا جس کے سبب وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھے۔ اب انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی خدمات، رضاکارانہ طور پر اپنی حکومت کو پیش کردیں، چنانچہ انھوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو بلجیم میں پاکستانی سفارت خانے کے توسط سے اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ایک خط تحریر کیا جس میں انھوں نے پاکستانی قوم کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ ایٹم بم کی تیاری میں استعمال ہونے والے فزائل نیوکلیئر میٹریل کو یورینیم کی افزودگی کے ذریعے تخلیق کیے جانے پر غور کریں۔ خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اس پورے طریقہ کار سے بخوبی آشنا ہیں اور بہ آسانی یہ سارا کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، چنانچہ ان کی خواہش ہے کہ واپس آکر ملک کی خدمت کریں۔ ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ان تمام سرگرمیوں کے پیچھے جو اصل محرکات

اور اغراض و مقاصد کارفرما تھے ان کا تعلق جذبہ حب الوطنی سے تھا۔ بس انھیں صرف ایک موقع کی تلاش تھی کہ اپنی تمام تر مہارت، صلاحیت، رابطوں اور رسائی کو اپنے وطن کی خدمت میں کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انتہائی موزوں اور مناسب وقت پر وطن کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔ انھوں نے ایسے لمحات میں پاکستان کو اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کی تھیں جب ان کا ملک ایک سنگین دور سے گزر رہا تھا۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام بھی نئی سمت اور نیا رخ اختیار کرنے ہی والا تھا۔ اس سے قبل ۱۹۵۴ء میں امریکی صدر آئزن ہاور کے "ایٹم برائے امن" کے نظریے کے تحت نچلی سطح کا ایک سویلین پروگرام تشکیل دیا گیا تھا جب ایک گشتی نمائش کے ذریعے جوہری طاقت کی حیرت انگیز کرشمہ سازیوں کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس نے ایک چھوٹا ایٹمی ری ایکٹر خریدا تاکہ اس سے بجلی کی پیداوار میں مدد لی جاسکے۔ تاہم ۱۹۷۱ء کی اُس شام ڈھاکا کے رمنا گرین ریس کورس گراؤنڈ میں ہونے والی ہتھیار ڈالنے کی تقریب نے پاکستان کے سیاسی، فوجی اور اسٹریٹجک تصورات کی تمام تر بنیادیں ہلاکر رکھ دی تھیں اور اب پاکستان کو ایک نئی سمت، نئے رخ اور نئے راستے کی تلاش تھی۔

۱۹۷۴ء میں بھارت کا ایٹمی دھماکہ

۱۹۷۴ء میں بھارتی ایٹمی دھماکے کے بعد پاکستان میں بھی ایٹم بم کی تیاری اور حصول کا جذبہ زور پکڑتا جارہا تھا۔ تاہم اس ایٹمی دھماکے کا حقیقی جواز بھارت کے ایٹمی دھماکے سے پیشتر ہی ۱۹۷۱ء میں اس وقت پیدا ہوچلا تھا جب مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش میں تبدیل ہوا اور پاکستانی افواج کو بھارت کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۷۰ء کے دوران منعقد ہونے والے عام قومی انتخابات کے نتائج نے پاکستان کی سیاسی اور

جغرافیائی تقسیم کو پوری طرح واضح کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستان کا قیام دو ایسے بازوؤں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے بہت بڑے فاصلے پر واقع تھے اور ان کے مابین کوئی مشترکہ سرحد بھی موجود نہ تھی۔ ان دونوں بازوؤں کے درمیان بھارت کا علاقہ واقع تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام شدید بے چینی اور عدم اطمینان کا شکار تھے کیونکہ ان سے دوسرے درجے کے شہری کا سلوک کیا جاتا تھا جب کہ افواج پاکستان اور سول سروس کے اعلیٰ ترین مناصب بھی مغربی پاکستانیوں کے پاس تھے۔ چنانچہ انتخابات کے نتیجے میں واضح سیاسی اور جغرافیائی تقسیم نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان کی حکومت نے مشرقی پاکستان میں کریک ڈاؤن کے احکام صادر کر دیے جس کے بعد بنگالی شہریوں پر سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس صورتحال نے بھارت کو فوجی مداخلت کا پورا جواز مہیا کر دیا جو بالآخر پاکستان کے دولخت ہونے پر ہی ختم ہوا۔

ہم گھاس کھا کر بھی ایٹم بم بنائیں گے

رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں پاکستان کی مسلح افواج کے ہتھیار ڈالنے کے چار روز بعد صدر جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے استعفیٰ دے دیا اور حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دی۔ بھٹو ایک کرشماتی شخصیت کے مالک اور نہایت متحرک اور فعال لیڈر تھے جو اپنی قوم کے مجروح پندار کا مداوا تلاش کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ وہ جوہری ہتھیاروں کے حصول کے بھی بہت بڑے حامی تصور کیے جاتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں جب بھٹو ایوب خان کی کابینہ میں وزیر تھے انھوں نے اس معاملے میں گہری دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے اپنا یہ تاریخی جملہ ادا کیا ''اگر بھارت ایٹم بم بناتا ہے تو خواہ ہمیں گھاس کھانی پڑے یا پتے یا پھر فاقہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن ہم بھی اپنا ایٹم بم بنا کر ہی رہیں گے۔''

چنانچہ ۲۰ رجنوری ۱۹۷۲ء کو ملتان میں ہونے والی ایک خفیہ میٹنگ میں ملک کی نہایت اعلیٰ سائنسی اور فوجی شخصیات نے شرکت کی جن میں سے بعض سائنس دان امریکا سے بھی آئے تھے تاکہ اپنے وطن کی خدمت کر سکیں۔ ان لوگوں کے روبرو تقریر کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو نے وعدہ کیا کہ وہ قوم کو اس کا گمشدہ وقار واپس دلا کر ہی دم لیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پاکستان نے ایٹم بم کی تیاری کا نہایت اہم سیاسی فیصلہ کر لیا ہے بلکہ میرے خیال میں ایک دن وہ بھی آئے گا جب تیسری دنیا کے تمام ممالک بھی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے کیونکہ وقت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ میٹنگ میں موجود سائنس دانوں نے بھٹو کو یقین دلایا کہ وہ پانچ برس کی مدت کے اندر اندر ایٹم بم تیار کر سکتے ہیں۔ بھٹو نے کہا کہ تین برس کی مدت میں آپ مجھے ایٹم بم تیار کر کے دے دیں جس کے لیے میں آپ کو ہر قسم اور ہر نوعیت کی سہولت اور ذرائع فراہم کروں گا اور آپ کی تائید وحمایت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔ بہرکیف ڈاکٹر عبدالقدیر خان اس مرحلے پر موجود نہ تھے نہ ہی اس میٹنگ کے شرکاء کے علاوہ کوئی اور یہ بات جانتا تھا۔ تاہم یہ طے تھا کہ پاکستان جوہری طاقت کے حصول کے طویل سفر پر روانہ ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

اسلامی بم

اس زمانے میں اسلامی بم کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جا رہا تھا اور یہ خیال بھی عام تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو پوری اسلامی دنیا کے لیے ایٹم بم تیار کرنے کے خواہش مند ہیں۔'' تاہم حقیقت یہ تھی کہ بھٹو کو ایٹم بم کی جانب راغب کرنے میں بھارت کے روایتی فوجی اسلحے اور ہتھیاروں کی برتری کے ساتھ ساتھ اس واقعے نے بھی اہم ترین کردار ادا کیا تھا کہ بھارت اب اس خطے میں ایک ابھرتی ہوئی ایٹمی طاقت بن چکا تھا۔ اس کے علاوہ بھٹو کی قوم پرستی اور حب الوطنی کا بھی یہ تقاضا تھا کہ دنیا کو بتا دیا جائے کہ پاکستان

اپنے لیے ایٹم بم بنانے کا ہر طرح سے اہل ہے اور وہ صلاحیت پوری دنیا کے روبرو پیش کرنے کے لیے مضطرب تھے۔ بھٹو کے محرکات کی نوعیت مذہبی ہرگز نہ تھی بلکہ اس کے برعکس وہ عالمی سطح کے ایسے قوم پرست لیڈر تھے جن کے ذہن میں ہر لمحہ یہ سوال گردش کرتا رہتا تھا کہ کیا ایٹمی ہتھیاروں اور اسلحے پر صرف اور صرف مغربی ممالک ہی کا حق ہے؟ کیا ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول پر صرف امریکا اور دیگر مغربی بڑی طاقتوں کی مستقل اجارہ داری رہے گی؟ دنیا کے ترقی پذیر بالخصوص ایشیائی اور افریقی ممالک ایٹمی ٹیکنالوجی سے کیا ہمیشہ کے لیے محروم رہیں گے؟ اس نوعیت کے سوالات انھیں ہر لحظہ پریشان اور مضطرب رکھتے تھے۔ دوسری جانب ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی انھی نظریات اور خیالات پر یقین رکھتے تھے اور ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ ایٹم بم اور ایٹمی طاقت پر صرف مغربی طاقتوں کا اجارہ نہیں ہونا چاہیے۔ بہرطور اسلامی بم کے حصول کا نعرہ اس اعتبار سے بڑا مفید اور سودمند ثابت ہوا کہ بیشتر اسلامی ممالک اس بم کو بنانے کی غرض سے پاکستان کو انتہائی خطیر رقوم دینے پر آمادہ ہوگئے۔ پاکستان اقتصادی نقطہ نظر سے ایک غریب اور ترقی پذیر ملک تھا اور ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے پروگرام پر اربوں ڈالر کے اخراجات کا کسی بھی صورت متحمل نہ ہوسکتا تھا لہٰذا اب سوال یہ تھا کہ اتنی بڑی اور بھاری رقم کہاں سے حاصل کی جائے؟

لیبیا اور اسلامی بم

ملتان میں پاکستانی سائنس دانوں اور اعلیٰ فوجی افسران کی خفیہ میٹنگ کے بعد آنے والے ہفتوں کے دوران پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو بیس ممالک کے غیرملکی دورے پر روانہ ہوگئے جن میں مشرق وسطیٰ کے ممالک ان کی توجہ کا خاص مرکز تھے۔ اس دورے میں انھوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے منصوبے کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کرایا جو طویل عرصے کے اندر اپنے ثمرات سے پوری اسلامی دنیا کو فیض

یاب کرسکتا تھا۔ ان ممالک میں لیبیا بھی شامل تھا جہاں بھٹو کی ملاقات لیبیا کے نئے اور نوجوان لیڈر معمر قذافی سے ہوئی جو بھٹو کا خیرمقدم کرنے کی غرض سے طرابلس ایئرپورٹ کے ٹارمیک تک بہ نفس نفیس آئے اور بھٹو سے بغل گیر ہوکر ان کے دونوں رخساروں پر عرب خیرمقدمی روایات کے عین مطابق بوسہ بھی دیا۔ لیبیا میں بھٹو کا قیام نہایت مختصر لیکن انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ قذافی بھٹو کو اپنی ذاتی رہائش گاہ پر لے گئے اور اپنی اہلیہ کو بھی اُن سے متعارف کرایا جو معزز مہمان کے احترام میں پاکستانی لباس زیب تن کیے ہوئے تھیں۔ دونوں لیڈروں کے انقلابی اور قوم پرستانہ نظریات وخیالات میں حیرت انگیز مماثلت اور یکسانیت موجود تھی۔ پاکستان یوں بھی لیبیا کا ممنون تھا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران اس نے پاکستان کو فوجی امداد فراہم کی تھی۔ اب ان دونوں ممالک کو مل کر ایک ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

کرنل معمر قذافی: لیبیا کا فوجی انقلاب: ۱۹۶۹ء

لیبیا کے لیڈر کرنل قذافی نے ۱۹۶۹ء میں صرف ۲۷ برس کی عمر میں اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ وہ ایک صحرانشین خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس کا تعلق بدوؤں کے قبیلے سے تھا۔ بعدازاں انھوں نے فوجی تربیت کے ادارے میں داخلہ لے لیا اور اس غرض سے برطانیہ بھی گئے اور لیبیا کی فوج میں شمولیت اختیار کرلی اور بہت جلد نوجوان فوجی افسران کے انقلابی گروپ کے لیڈر بن گئے۔ ایک فوجی بغاوت کے دوران انھوں نے لیبیا کے بادشاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود نہایت کم عمری میں برسراقتدار آگئے۔ وہ نوآبادیاتی نظام اور مغربی طرز زندگی کے سخت مخالف تھے، چناں چہ انھوں نے لیبیا کے لیے بھی یہی راستہ منتخب کیا۔ قذافی بھی ایک کرشماتی لیڈر تھے اور انھیں اپنی شخصیت پر اس قدر گہرا اعتماد تھا کہ انھوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہ ظاہر کردیا کہ وہ اپنے ملک کے لیے ایٹمی ہتھیار حاصل کرنے کے شدت سے خواہش مند ہیں۔ ان ایٹمی ہتھیاروں کو

انھوں نے "شمشیرِ اسلام" کا نام دے رکھا تھا۔ چناں چہ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنے اور ذاتی امیج کے فروغ کی غرض سے ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی کوششوں میں پہلے ہی مصروف تھے، جو انھیں عالمی سیاسی اسٹیج پر ایک اہم مقام دلا سکتا تھا۔ لیبیا، تیل کی دولت سے مالا مال ضرور تھا لیکن اس کے پاس نہ ہی ایسی ٹیکنالوجی اور نہ ہی ایسے سائنس دان تھے جن کی مدد سے وہ اپنا ایٹمی پروگرام شروع کر سکتا۔ چناں چہ ۱۹۷۰ء میں جب انھیں اقتدار حاصل کیے زیادہ مدت نہیں گزری تھی تو انھوں نے اپنا ایک نمائندہ عوامی جمہوریہ چین بھیجا تھا تاکہ چینی حکومت سے ایٹم بم کی خریداری پر گفت و شنید کر سکے تاہم اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اب پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اس مقصد سے لیبیا آئے تھے اور اپنے ایٹمی پروگرام کے لیے پیسے کے طلب گار تھے لہٰذا لیبیا کے نوجوان حکمران کے ذہن میں فوری طور پر یہ خیال آیا کہ موقع اچھا ہے پاکستان سے کوئی معاہدہ ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو۔ لیبیا پاکستان کو رقومات فراہم کرے گا جس کی مدد سے پاکستان ایٹمی ہتھیار بنانے کے قابل ہو جائے گا۔ ۱۹۷۳ء کے دوران پیرس میں خفیہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے دوران بھٹو نے اسلامی دنیا کے ساتھ پاکستان کے ہم رشتہ ہونے پر بڑا زور دیا اور اسلامی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اسی کانفرنس کے دوران انھوں نے لیبیا کے نوجوان انقلابی لیڈر کرنل معمر قذافی کا بھی بھرپور خیر مقدم کرتے ہوئے لاہور کے کرکٹ اسٹیڈیم کا نام قذافی اسٹیڈیم رکھنے کا اعلان کیا۔

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے سربراہ منیر احمد خان معمر قذافی کو کراچی بھی لے گئے جہاں انھیں کراچی کے ایٹمی ری ایکٹر کو دیکھنے کا موقع ملا۔ لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں لیبیا کے لیڈر نے ایک بہت بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اگر پاکستان کو کسی بھی ملک نے کوئی دھمکی دی تو لیبیا اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔

انھوں نے مزید کہا ہمارے ذرائع اور وسائل پاکستان کے لیے وقف ہیں اور لیبیا پاکستان کو ہر قسم کی امداد اور سہولت فراہم کرے گا۔ چناں چہ طرابلس سے روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہتے ہوئے پاکستان پہنچنے لگا۔ تاہم ۱۹۷۶ء میں ڈی کلاسیفائیڈ معلومات اور اطلاعات کے مطابق امریکی حکومت کو انٹیلی جنس نے یہ خبر پہنچا دی تھی کہ لیبیا اور پاکستان کے مابین فنانسنگ کا معاہدہ تو موجود ہے جس کے بارے میں یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ مستقبل میں ان دونوں ممالک کے مابین کسی قسم کا جوہری تعاون عین ممکن ہے۔

لیبیا کی جانب سے پاکستان کو دی جانے والی مالی امداد اور بھاری رقومات کے عوض لیبیا کی حکومت کو یہ توقع تھی کہ اسے ایٹمی ٹیکنالوجی تک مکمل براہِ راست رسائی حاصل ہو سکے گی تاہم بہت جلد کرنل معمر قذافی کا ذہن تبدیل ہونے لگا۔ انھوں نے پاکستانی حکومت سے یہ مطالبہ کر دیا کہ مشترکہ پروجیکٹس لیبیا ہی میں قائم کیے جائیں خواہ اس کے لیے افرادی قوت اور مہارت پاکستان ہی سے کیوں نہ فراہم کی جائے۔ چناں چہ رفتہ رفتہ دونوں ممالک کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے لگی۔ بھٹو نے اسلامی بم کا نعرہ اس لیے لگایا تھا کہ اس طرح پاکستان کو اسلامی دنیا کی جانب سے پوری تائید اور حمایت حاصل ہو سکے گی لیکن ذاتی طور پر انھیں یہ احساس بھی تھا کہ ایسے کسی بھی اسلامی بم کے فیوض اور ثمرات صرف پاکستان تک ہی محدود رہنے چاہئیں تاکہ مغربی دنیا بھی اسے قبول کر لے۔ بھٹو نے اپنی صاحبزادی بے نظیر بھٹو کو خط میں تحریر کیا تھا کہ دنیا پاکستانی بم کو تو قبول کر لے گی لیکن اسلامی بم کو قبول کرنا اس کے لیے ناممکن ہوگا۔

سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں سے مالی امداد

بھٹو نے بیس ممالک کے دورے میں سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کا بھی دورہ کیا تھا اور ایٹم بم کی تیاری اور حصول کے لیے مالی امداد فراہم کرنے کی درخواست کی تھی۔

سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں ۱۹۷۳ء میں تیل کے بحران کے نتیجے میں حاصل ہونے والے محصولات نے دولت کے انبار کھڑے کر دیے تھے چناں چہ وہ اسرائیلی بم کے جواب میں اپنا ایٹم بم بنانے کی بھی شدید خواہش رکھتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں اسرائیل کے ہاتھوں ہونے والی شکست نے عرب اور مسلمان ممالک کے پندار اور احساسِ تفاخر کو شدید طور پر مجروح کیا تھا اور یہ سبھی کوشاں تھے کہ اسرائیل سے مساوی مقابلے کے لیے اس نئی ایٹمی ٹیکنالوجی کو آزما کر دیکھا جائے۔ تاہم بہت سے عرب ممالک کو یہ خدشات بھی لاحق تھے کہ اگر کوئی ایک عرب ملک ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول میں کامیاب ہو بھی گیا تو عین ممکن ہے اسرائیل اس کی ایٹمی تنصیبات کو اس طرح اپنا نشانہ بنا لے جس طرح اس نے ۱۹۸۱ء میں عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کر دیا تھا، چوں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو بنیادی طور پر بھارت کے خلاف ہی تصور کیا جاتا ہے لہٰذا اس بات کا امکان بہت کم ہوگا کہ اسرائیل اسے روکنے کی کوئی کوشش کرے۔ چناں چہ سعودی عرب نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بھرپور حمایت شروع کر دی اور خفیہ طور سے بھاری رقومات بھی فراہم کرتا رہا تا کہ پاکستان اس کے عوض سعودی عرب کو تحفظ کی ضمانت دے یا پھر ایٹمی ٹیکنالوجی تک براہِ راست رسائی کی سہولت فراہم کرے۔ پاکستان کی جانب سے ایٹمی صلاحیت کے حصول کو سعودی عرب نے ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھا ہے کیونکہ سعودی عرب پاکستان کو اپنا قابلِ اعتماد دوست سمجھتا ہے اور اسے پورا یقین ہے کہ جب کبھی کوئی برا وقت آیا پاکستان سعودی عرب کو تنہا نہیں چھوڑے گا اور اس کی ہر ممکن مدد کو آئے گا۔ خلیجی ریاستوں سے ایٹمی پروگراموں کی تکمیل کے لیے پاکستان بھیجا جانے والا پیسہ، شبہ کیا جاتا ہے کہ بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل (بی سی سی آئی) کے توسط سے ارسال کیا جاتا تھا۔

عوامی جمہوریہ چین

پاکستان کے سابق وزیر خارجہ کی حیثیت سے ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ نہایت قوی اور گہرے دوستانہ تعلقات کے قیام میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۶ء کے سالوں میں عوامی جمہوریہ چین کے اہم دورے کیے۔ ۱۹۷۶ء کا دورہ چین بالخصوص بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ بھٹو کو اس حقیقت کا بخوبی ادراک تھا کہ عوامی جمہوریہ چین پاکستان کی مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار ہوگا تا کہ وہ بھارت کا مقابلہ کر سکے۔ یاد رہے کہ ۱۹۶۲ء کے دوران چین اور بھارت کے مابین بھی سرحدی جنگ ہو چکی تھی۔ چین کی جانب سے دی جانے والی فوجی اور اقتصادی امداد اور اخلاقی حمایت کو بھٹو نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا اور وہ اسے اپنا عظیم کارنامہ تصور کرتے تھے۔ چین کی یہ تائید و حمایت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے لیے بھی مستقل طمانیت اور اہمیت کا باعث تھی۔ خفیہ طور پر بھٹو نے ایٹمی ٹیکنالوجی اور ایٹم بم کی تیاری کے لیے بھی در پردہ چین کی بھرپور تائید و حمایت حاصل کر لی تھی۔ بہرکیف اس سلسلے میں چین کا کردار ایک خاموش شراکت دار کا تھا جس نے شروع کے سالوں میں اہم ترین تکنیکی امداد پاکستان کو فراہم کی تھی۔

۱۸ مئی ۱۹۷۴ء: پوکھران میں بھارت کا ایٹمی دھماکہ

۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو صبح ۸ بجے بھارت نے راجھستان کے صحرائی گاؤں ''پوکھران'' میں اپنا پہلا ایٹمی دھماکا کر دیا جسے ''پُرامن ایٹمی دھماکے'' کا نام دیا گیا۔ پوری دنیا میں بھارت کے اس پہلے ایٹمی دھماکے کا شدید منفی ردِعمل ہوا اور دنیا نے اسے جوہری عدم پھیلاؤ کے حوالے سے بھارت کی سنگین خلاف ورزی قرار دیا لیکن اس دھماکے کا فوری اور انتہائی شدید ردِعمل اسلام آباد میں ہوا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں بھٹو نے جس پروگرام کا آغاز کیا تھا اب اس نے انتہائی اور فوری اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ایٹمی طاقت بننا کوئی آپشن

سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں ۱۹۷۳ء میں تیل کے بحران کے نتیجے میں حاصل ہونے والے محصولات نے دولت کے انبار کھڑے کردیے تھے چناں چہ وہ اسرائیلی بم کے جواب میں اپنا ایٹم بم بنانے کی بھی شدید خواہش رکھتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں اسرائیل کے ہاتھوں ہونے والی شکست نے عرب اور مسلمان ممالک کے پندار اور احساسِ تفاخر کو شدید طور پر مجروح کیا تھا اور یہ بھی کوشاں تھے کہ اسرائیل سے مساوی مقابلے کے لیے اس نئی ایٹمی ٹیکنالوجی کو آزما کر دیکھا جائے۔ تاہم بہت سے عرب ممالک کو یہ خدشات بھی لاحق تھے کہ اگر کوئی ایک عرب ملک ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول میں کامیاب ہو بھی گیا تو عین ممکن ہے اسرائیل اس کی ایٹمی تنصیبات کو اس طرح اپنا نشانہ بنالے جس طرح اس نے ۱۹۸۱ء میں عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کردیا تھا، چوں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو بنیادی طور پر بھارت کے خلاف ہی تصور کیا جاتا ہے لہٰذا اس بات کا امکان بہت کم ہوگا کہ اسرائیل اسے روکنے کی کوئی کوشش کرے۔ چناں چہ سعودی عرب نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بھرپور حمایت شروع کردی اور خفیہ طور سے بھاری رقومات بھی فراہم کرتا رہا تاکہ پاکستان اس کے عوض سعودی عرب کو تحفظ کی ضمانت دے یا پھر ایٹمی ٹیکنالوجی تک براہِ راست رسائی کی سہولت فراہم کرے۔ پاکستان کی جانب سے ایٹمی صلاحیت کے حصول کو سعودی عرب نے ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھا ہے کیونکہ سعودی عرب پاکستان کو اپنا قابلِ اعتماد دوست سمجھتا ہے اور اسے پورا یقین ہے کہ جب بھی کوئی برا وقت آیا پاکستان سعودی عرب کو تنہا نہیں چھوڑے گا اور اس کی ہر ممکن مدد کو آئے گا۔ خلیجی ریاستوں سے ایٹمی پروگراموں کی تکمیل کے لیے پاکستان بھیجا جانے والا پیسہ، شبہ کیا جاتا ہے کہ بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل (بی سی سی آئی) کے توسط سے ارسال کیا جاتا تھا۔

عوامی جمہوریہ چین

پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ نہایت قوی اور گہرے دوستانہ تعلقات کے قیام میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۶ء کے سالوں میں عوامی جمہوریہ چین کے اہم دورے کیے۔ ۱۹۷۶ء کا دورہ چین بالخصوص بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ بھٹو کو اس حقیقت کا بخوبی ادراک تھا کہ عوامی جمہوریہ چین پاکستان کی مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار ہوگا تاکہ وہ بھارت کا مقابلہ کرسکے۔ یاد رہے کہ ۱۹۶۲ء کے دوران چین اور بھارت کے مابین بھی سرحدی جنگ ہوچکی تھی۔ چین کی جانب سے دی جانے والی فوجی اور اقتصادی امداد اور اخلاقی حمایت کو بھٹو نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا اور وہ اسے اپنا عظیم کارنامہ تصور کرتے تھے۔ چین کی یہ تائید و حمایت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے لیے بھی مستقل طمانیت اور اہمیت کا باعث تھی۔ خفیہ طور پر بھٹو نے ایٹمی ٹیکنالوجی اور ایٹم بم کی تیاری کے لیے بھی درپردہ چین کی بھرپور تائید و حمایت حاصل کرلی تھی۔ بہرکیف اس سلسلے میں چین کا کردار ایک خاموش شراکت دار کا تھا جس نے شروع کے سالوں میں اہم ترین تکنیکی امداد پاکستان کو فراہم کی تھی۔

۱۸رمئی ۱۹۷۴ء: پوکھران میں بھارت کا ایٹمی دھماکہ

۱۸رمئی ۱۹۷۴ء کو صبح ۸ بجے بھارت نے راجھستان کے صحرائی گاؤں "پوکھران" میں اپنا پہلا ایٹمی دھماکا کردیا جسے "پُرامن ایٹمی دھماکے" کا نام دیا گیا۔ پوری دنیا میں بھارت کے اس پہلے ایٹمی دھماکے کا شدید منفی ردِّعمل ہوا اور دنیا نے اسے جوہری عدم پھیلاؤ کے حوالے سے بھارت کی سنگین خلاف ورزی قرار دیا لیکن اس دھماکے کا فوری اور انتہائی شدید ردِّعمل اسلام آباد میں ہوا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں بھٹو نے جس پروگرام کا آغاز کیا تھا اب اس نے انتہائی اور فوری اہمیت حاصل کرلی تھی۔ ایٹمی طاقت بننا کوئی آپشن

نہ تھا بلکہ اسے ایک مقصد اور نصب العین کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی پاکستان آمد

بھارت کے ایٹمی دھماکے کا فوری اثر ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر بھی ہوا جو اُن دنوں نیدرلینڈ میں موجود تھے اور واقعات کا اتار چڑھاؤ دیکھنے میں مشغول تھے۔ بس یہی وہ موڑ اور نقطہ تھا جہاں سے عبدالقدیر خان کی ''ایٹمی جاسوسی'' کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کے چند ماہ بعد ہی انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے نام ایک خط میں اپنی رضا کارانہ خدمات پاکستان کے لیے پیش کیں۔ بھارت کے ایٹمی دھماکے نے بھٹو کو مجبور کر دیا کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی پیشکش پر ازسرِ نو غور و خوض کرتے ہوئے اس پر عمل درآمد کریں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بھٹو کو جو خط ارسال کیا تھا وہ سب سے پہلے بھٹو کے ملٹری سیکرٹری کی نظر سے گزرا تھا جس نے یہ خط وزیراعظم کے حوالے کیا۔ وزیراعظم نے اس خط پر یہ ریمارکس لکھے ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی بات میں وزن ہے۔'' اور یہ خط اٹامک انرجی کمیشن کے سربراہ منیر احمد خان کو بھجوا دیا اور ان سے کہا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے ان کی ملاقات کا بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان پاکستان آئے جہاں انھوں نے پاکستانی حکام سے متعدد خفیہ نوعیت کی ملاقاتیں کیں۔ انھوں نے اپنا خفیہ نام ''کریم'' رکھا ہوا تھا اور کراچی میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ان کا قیام تھا۔ بعد میں ڈاکٹر خان نے انکشاف کیا کہ ملاقات بھٹو سے بھی ہوئی تھی لیکن اس بات کے ٹھوس شواہد نہ مل سکے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے کہا گیا کہ حکومت پاکستان کو ان کی خدمات کی ضرورت ہے لیکن ابھی انھیں نیدرلینڈ میں مزید قیام کرنا ہوگا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ صلاحیت، اہلیت اور مہارت بہم پہنچا سکیں۔

نیدرلینڈ کو واپسی

چناں چہ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیدرلینڈ واپس روانہ ہو گئے۔

اب ایٹمی رازوں کو چرانے کا کام ان کے لیے کافی سہل ہو چکا تھا۔ فرانس اور بیلجیم میں واقع پاکستانی سفارت خانوں کی سفارتی نمبر پلیٹ لگی گاڑیاں رات سے صبح تک ان کے گھر کے پاس دیکھی جانے لگیں۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں انھیں اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ سولہ دن اس نام نہاد ''برین باکس'' میں گزار سکتے ہیں جو المیلو میں واقع تھا اور جہاں انتہائی حساس نوعیت کا کام کیا جاتا تھا۔ ان کے ہمراہ کسی محافظ یا ساتھی کا جانا ضروری تھا تاہم اکثر اوقات وہ اکیلے ہی وہاں چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے لیے ایٹمی جاسوسی اور جوہری ٹیکنالوجی کے سارے اسرار و رموز اور رازوں کے بھی دروازے مکمل طور پر کھل چکے تھے اور انھیں G-2 سینٹری فیوج کے تازہ ترین منصوبوں تک بھی براہ راست رسائی حاصل ہو چکی تھی۔ ۱۹۷۵ء کے دوران ڈاکٹر خان کو ایسی اطلاعات موصول ہو گئیں اور اتنی بیش قیمت معلومات تک ان کی رسائی ہو گئی جن کے نتیجے میں وہ پاکستانی قوم کے لیے ''قومی ہیرو'' کا درجہ حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں اور انھی اطلاعات نے انھیں بین الاقوامی طور پر ایک ایسے ایٹمی سائنسدان کی حیثیت سے شہرت بخشی جو جوہری پھیلاؤ پر یقین رکھتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے نیدرلینڈ سے ڈرائنگ بورڈ پر موجود بھی سینٹری فیوج ڈیزائنوں کو حاصل کر لیا تھا جس کا اعتراف بعد میں یورینکو کے افسران اور اہلکاروں نے بھی کیا تھا۔

بحری جہاز-بی بی سی چائنا-۳۰ برس بعد

اس واقعے کے تیس برس بعد بحری جہاز بی بی سی چائنا کے بعض کنٹینرز میں جو پرزے اور سامان لدا ہوا پایا گیا تھا اور ایران و لیبیا کے حوالے سے جو زمینی حقائق اور انکشافات سامنے آئے جن میں سے بعض ابھی تک شمالی کوریا میں پوشیدہ ہیں، ان سب کے مدنظر یہ بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام کے تمام ۱۹۷۰ء کے عشرے میں نیدرلینڈ میں تیار کیے گئے سینٹری فیوجز ڈیزائن ہی کے اخذ کیے گئے عکس اور نقلیں تھیں۔ یہ ڈیزائن

انتہائی انمول اور بیش قیمت تھے۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ طبعی مواد اور مادی اشیاء کے مقابلے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی تمام جدوجہد کی اصل بنیاد ان اطلاعات، علم اور معلومات پر قائم تھی جو انھیں خوش قسمتی سے حاصل ہوگئیں اور جو ان کی کامیابی کا سب سے اہم راز بھی ہے۔ یہی علم ان کی کامیابی کا نچوڑ ثابت ہوا۔

جوہری پھیلاؤ کا آغاز: مشکوک سرگرمیاں

۱۹۷۵ء کے دوران پاکستان کے نوجوان سائنسدان سلطان بشیر الدین محمود جو ملتان میں ہونے والی خفیہ میٹنگ میں بھی شریک تھے اور بھٹو کے ایٹمی منصوبے کی پرزور حمایت میں پیش پیش تھے۔ اب انھیں ایک کلیدی شخصیت کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی اور وہ یورپ کے دورے پر تھے تاکہ اس جوہری ٹیکنالوجی کی تلاش و تحقیق شروع کرسکیں جو ایٹمی پروگرام کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ عبدالقدیر خان نیدر لینڈ سے سلطان بشیر الدین محمود سے ملاقات کی غرض سے آئے اور ان دونوں نے ایک پاکستانی سفارت کار کے گھر پر قیام کیا۔ کچھ ہی دنوں بعد اہم ڈرائنگز اور بلیو پرنٹس جنھیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے تیار کیا تھا بیچ کے کسی آدمی کے ذریعے باہر آنے لگیں، جن پر فراہم کرنے والے کا نام بھی لکھا ہوتا تھا۔ چناں چہ وہ افراد اور ادارے جو ایٹمی ٹیکنالوجی کی خریداری میں دلچسپی رکھتے تھے بڑی تعداد میں اس درمیانی آدمی سے رابطہ قائم کرنے لگے۔ ۱۹۷۵ء کے دوران ہی جوں جوں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ہمت بڑھنے لگی وہ اس معاملے میں قدرے لاپروا بھی ہوتے گئے۔ ان کے دوست فریٹس ویرمین کے ذہن میں بھی شکوک و شبہات جنم لینے لگے چناں چہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے مکان پر ویرمین کو نہ صرف سینٹری فیوج کی ڈیزائنر ملیں بلکہ انھوں نے ایسی ٹیلی فون کالیں بھی درمیان ہی سے سنیں جن پر پاکستان میں موجود لوگوں اور یورپ کے مختلف پاکستانی سفارت خانوں سے سینٹری فیوجز ٹیکنالوجی کی بابت گفتگو کی جایا کرتی تھی۔ سینٹری فیوجز ٹیکنالوجی کی انتہائی

حساس، نازک اور اہم تفصیلات کے بارے میں ڈاکٹر خان ویرمین کی موجودگی ہی میں نہایت کھل کر گفتگو کیا کرتے تھے چناں چہ فریٹس ویرمین نے کوئی تین مرتبہ اپنے منیجرز کو آگاہ کیا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایٹمی راز اور سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کی معلومات جاسوسی کے ذریعے حاصل کر رہے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی ان کی اس بات پر یقین نہیں کیا۔ انھیں اس کا یقین ہی نہیں ہوا کہ ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے اس ضمن میں کوئی اقدام نہیں کیا۔ FDO پر سیکیورٹی کے ناقص ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان سے بعض مواقع پر ایسے گروپ بھی وہاں آتے رہتے تھے جن کے ذریعے سینٹری فیوج ڈیزائن کے بعض حصے پاکستان پہنچتے رہے۔ ۱۹۷۵ء ہی کے دوران ایسی خبریں بھی گشت کرنے لگیں کہ ڈچ حکمران عبدالقدیر خان کی گرفتاری کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں لیکن مبینہ طور پر امریکی انٹیلی جنس ایجنسی، سی آئی اے نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا کیوں کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے تعاقب اور نگرانی کے نتیجے میں ابھی مزید معلومات اور انکشافات حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ بہرکیف امریکی افسران کا کہنا ہے کہ ان کا اس معاملے سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے برعکس ڈچ حکومت ڈاکٹر خان پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی جو انھیں بروقت پکڑنے میں ناکام رہی کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر خان ابھی فوری طور پر اچانک نیدر لینڈ سے پاکستان واپس نہیں جائیں گے۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۷۵ء ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی پاکستان مستقل آمد

دوسری جانب ڈاکٹر خان کے قریبی دوست ہینک سلیبوس کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ڈچ سیکیورٹی پولیس سے براہِ راست رابطہ تھا اور وہ باقاعدگی سے ملاقاتیں بھی کیا کرتے تھے لہٰذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈچ افسران نے انھیں گرفتار کیوں نہیں کیا؟ پلانٹ پر متعین سیکیورٹی افسران کا بھی کہنا یہی ہے کہ ڈاکٹر خان کے

مشکوک کردار اور مشتبہ رویوں پر شک ہو چلا تھا کیوں کہ وہ بالعموم ایسے سوالات پوچھا کرتے تھے جن کا ان کی موجودہ سرگرمیوں سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا نہ ہی وہ ان کے دائرہ کار میں آتی تھیں۔ بہرکیف جب اعلیٰ افسران تک یہ معلومات پہنچائی گئیں تو ان کا یہی جواب تھا کہ ابھی اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کیا جائے۔ معاملے کو نظر انداز کرنے کا فوری سبب جو ذہن میں آسکتا ہے وہ یہی ہے کہ سیکیورٹی سروسز کا خیال یہ تھا کہ ابھی ڈاکٹر خان کی جملہ سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنا زیادہ بہتر ہوگا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے عزائم کی نوعیت کیا ہے اور ان کے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟ یہی کچھ سوچ کر وہ مزید انتظار کرتے رہے جو بہرصورت ایک بھاری غلطی تھی جس کا بہت بڑا خمیازہ آگے چل کر بھگتنا پڑا۔ درحقیقت سیکیورٹی سروسز کو ڈاکٹر خان کی ذہانت، ذکاوت، حافظے اور صلاحیت کا ٹھیک طور سے کوئی اندازہ نہ تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر خان کی اہلیت کا حقیقی اندازہ لگانے میں ناکام رہے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ آیندہ چل کر وہ کتنا بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان اطلاعات اور شکوک وشبہات سے اتنا ضرور ہوا کہ انھیں فوری طور پر سینٹری فیوج پروگرام سے علیحدہ کرکے کسی اور شعبے میں ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اسی وقت اس حقیقت کا ادارک کر لیا تھا وہ اسے حاصل کر چکے تھے لہٰذا اب وہاں ان کا کوئی کام نہ تھا۔ وطن واپسی کے سوا اب کوئی چارہ کار نہ رہا تھا چناں چہ دو ماہ کی مدت کے اندر ڈاکٹر خان ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو وہاں سے روانہ ہو گئے جہاں انھوں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ مختصر رخصت پر پاکستان جا رہے ہیں۔ پاکستان آمد کے بعد ڈاکٹر خان کی اہلیہ ہینڈرینا نے نیدرلینڈ میں اپنے دوستوں کو خط میں لکھا کہ ڈاکٹر خان زرد بخار میں مبتلا ہو گئے ہیں اور شاید دو ماہ مزید آرام کریں گے۔ پاکستان آمد کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا اب وقت آن پہنچا ہے کہ وہ پاکستان میں یورینیم کو افزودہ کرنے کے پروگرام کا کنٹرول سنبھالیں۔ چناں چہ انھوں نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد اپنے سابق آجر

کو استعفیٰ ارسال کر دیا۔

منیر احمد خان سے اختلافات

ڈاکٹر عبدالقدیر خان فطرتاً اپنے گرد دوسرے افراد کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ ان کی طبیعت کا یہ انوکھا پہلو اس وقت سامنے آیا جب وہ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں پاکستان لوٹ آئے تھے۔ وہ دوسروں کو اپنی راہ میں حائل کبھی نہیں دیکھ سکتے لہٰذا انھوں نے ایسے تمام افراد کو اپنے راستے سے رفتہ رفتہ ہٹا دیا۔ سلطان بشیر الدین محمود کے ساتھ وہ یورپ میں کام کر چکے تھے۔ وہ بھی اب پاکستان آ چکے تھے اور سہالہ میں ایک پائلٹ انرو چمنٹ پروگرام پر کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر خان ان کی ماتحتی میں ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام بھی کر چکے تھے۔ بہرحال ۱۹ر اپریل ۱۹۷۶ء کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اٹیمی انرجی کمیشن کے چیئرمین منیر احمد خان کے نام اپنے ایک خط میں سلطان بشیر الدین محمود کے ہمراہ کام کرتے ہوئے اپنی شدید بے اطمینانی کا اظہار کیا اور لکھا کہ میں اپنے موجودہ کام سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں۔ اب تک مجھ سے جو کام لیا گیا ہے میں اس سے دس گنا زیادہ کام کر کے دکھا سکتا ہوں۔

اربابِ اختیار سے قربت

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صاحبانِ اقتدار کی قربت حاصل کر کے ان کا اعتماد اور اعتبار جیت لینے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں، چناں چہ انھوں نے بھٹو کو اعتماد میں لے کر انھیں یقین دلایا کہ یورینیم کی افزودگی کے سلسلے میں پیش رفت انتہائی سست ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اپنا ایک علیحدہ ادارہ قائم کر کے اس کام کو نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھائیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس اعتبار سے بھی دوسروں پر سبقت اور اوّلیت حاصل تھی کہ وہ واحد شخص تھے جنھوں نے کسی سینٹری فیوج کو عمل کی حالت میں دیکھ رکھا تھا اور وہ اس کی تمام کارکردگی کے بارے میں مکمل معلومات

رکھتے تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ بھٹو کو اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ جولائی ۱۹۷۶ء میں انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹری (ERL) کا قیام ایک آزاد اور خود مختار ادارے کی حیثیت سے عمل میں آیا جس کے سربراہ خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان تھے اور جو براہ راست پاکستان کے وزیر اعظم کو جواب دہ تھا۔ ارل ادارے کے قیام کے نتیجے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو طاقت اور اختیارات کی وہ حقیقی بنیاد فراہم ہو گئی اور انھیں وہ خود مختاری اور معاملات کو خفیہ رکھنے کی آزادی میسر ہو گئی جس کے نتیجے میں انھوں نے وہ سب کچھ کر ڈالا جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ بعدازاں تین ارکان پر مشتمل ایک بورڈ بھی تشکیل دیا گیا جو وقتاً فوقتاً اس نئے ادارے کی کارکردگی کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ اس بورڈ میں اے جی این قاضی، غلام اسحٰق خان اور آغا شاہی شامل تھے۔

کہوٹہ کا انتخاب

اب دوسرا مرحلہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خفیہ منصوبوں اور پلانٹ کی تنصیب کے لیے جگہ کی تلاش کا تھا۔ ڈاکٹر خان نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لے لیا اور متعدد مقامات اور جگہیں دیکھ ڈالیں۔ اپنے پلانٹ کی تنصیب کے لیے انھیں ایک ایسے خفیہ اور زمین دوز پہاڑی مقام کی تلاش تھی جس تک کوئی بھی نہ پہنچ پائے۔ ایسی جگہ کی تلاش مسلسل میں انھوں نے پہاڑوں پر ہزاروں میل کا سفر طے کیا جس کے دوران ان کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ بہرنوع ان کی یہ مسلسل تلاش بالآخر کامیاب ہو گئی اور ستمبر ۱۹۷۶ء میں وہ کہوٹہ کے محل وقوع پر رضامند ہو گئے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ کہوٹہ اسلام آباد سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ اس مقام پر زیرِ زمین ایسی عمارات بھی تعمیر کی جا سکتی تھیں جہاں دشمن کے کسی بھی حملے کے باوجود حساس نوعیت کا سارا کام محفوظ رہ سکتا تھا۔ کہوٹہ میں ایٹمی پلانٹ کی تعمیر کے لیے ایک سو ایکڑ زمین کی ضرورت تھی جس کے عوض حکومت پاکستان نے ان زمینوں کے مالکان کو منہ مانگی قیمت ادا کی۔

کہوٹہ میں کیے جانے والے خفیہ نوعیت کے انتہائی حساس کام کو پراجیکٹ 706 کا کوڈ نام دیا گیا۔ ابتداء ہی سے یہ پورا علاقہ انتہائی سخت قسم کی نگرانی اور سیکیورٹی میں کام کر رہا تھا حتیٰ کہ ایوان وزیر اعظم کو بھی اتنی سیکیورٹی فراہم نہیں کی جاتی تھی۔

۱۹۷۷: جمی کارٹر بحیثیت امریکی صدر

۱۹۷۷ء میں جمی کارٹر امریکا کے عہدۂ صدارت پر فائز ہو گئے۔ انھوں نے اپنی صدارتی مہم کے دوران بنیادی ترجیح جوہری قوت کے عدم پھیلاؤ کو دینے کا اعلان کیا تھا اور اب برسرِ اقتدار آ کر وہ اس بات کے پابند تھے کہ ''دنیا بھر میں جوہری عدم پھیلاؤ کے لیے کام کریں۔ جوہری پھیلاؤ کو جوہری ہتھیاروں کی تیاری سے وابستہ کر دیا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ جوہری قوت کے پھیلاؤ کا جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے گہرا تعلق ہے۔ ۱۹۷۴ء کے دوران بھارت کے ایٹمی دھماکے نے جوہری عدم پھیلاؤ کے نظریے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ اب دنیا کے ترقی یافتہ مغربی ممالک کے علاوہ دیگر ممالک اور اقوام بھی جوہری ٹیکنالوجی کے حصول میں کوشاں تھیں۔

یہ ممالک تجارتی اور اسٹریٹجک مقاصد کے پیش نظر جوہری ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ ۱۹۷۳ء میں تیل کے عالمی بحران کے نتیجے میں جوہری طاقت کے حصول میں بے حد کشش پیدا ہو چکی تھی جس نے پوری دنیا کو احساس دلایا تھا کہ توانائی کے لیے دیگر ملکوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا اور اب اس سلسلے میں خود کفیل ہونے کی غرض سے جوہری توانائی کا بہر قیمت حصول ہی زندہ رہنے کا واحد راستہ ہے۔ دوسری کشش یہ تھی کہ جوہری توانائی کی مدد سے ہتھیار اور اسلحہ بھی تیار کیا جا سکتا ہے جو قومی سلامتی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے اشد ضروری ہیں۔ چناں چہ ۱۹۷۵ء تک آتے آتے ایران کے شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی سمیت عراق، برازیل، ارجنٹائن، جنوبی کوریا اور تائیوان بھی جوہری طاقت کے حصول میں کوشاں ہو چکے تھے تا کہ جوہری ہتھیار، اسلحہ اور ایٹم بم

بنا سکیں۔

جوہری ٹیکنالوجی اور ہتھیاروں کی فروخت

جوں جوں جوہری ٹیکنالوجی اور ہتھیاروں کی مانگ میں اضافہ ہوتا گیا ایسے ترقی یافتہ ممالک بھی سامنے آنے لگے جو جوہری مواد اور ساز و سامان کی فراہمی کے لیے آمادہ تھے۔ ان ممالک میں باقاعدہ دوڑ اور مسابقت شروع ہو گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کی جا سکے۔ چناں چہ جرمنی نے برازیل سے سودا طے کر لیا۔ فرانس نے پاکستان کو ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی جس کے بعد صورت حال قابو سے باہر ہونے لگی۔ بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد امریکا نے جوہری ایندھن کی فراہمی کے نئے معاہدوں پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس سے قبل امریکی حکومت رعایتی نرخوں پر جوہری ایندھن فراہم کرتی آ رہی تھی جس کے نتیجے میں دیگر ممالک کو یہ موقع فراہم نہ ہو سکے کہ وہ بھی جوہری ایندھن کی فروخت میں شریک ہو سکیں۔ چناں چہ جوہری ٹیکنالوجی، مواد اور ساز و سامان کی فروخت کی صورت میں یورپین ممالک کو ایک شاندار تجارتی موقع مل گیا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ بے شمار دولت کما سکتے تھے۔ امریکی سی آئی اے کے اندازوں کے مطابق بین الاقوامی جوہری برآمدات، آئندہ پانچ برس کے دوران پچاس بلین ڈالرز تک پہنچ سکتی تھیں۔

امریکی سی آئی اے اور پاکستان کا جوہری پروگرام

امریکی حکومت نے اس بات کا پختہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ جوہری لین دین اور سودے بازی کی اس روش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر کے دم لے گی۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے آخری مہینوں میں امریکی سی آئی اے کو یہ سن گن مل چکی تھی کہ پاکستان جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں دلچسپی رکھتا ہے۔ تاہم اسے یہ یقین تھا کہ اگر پاکستان جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے کسی پروگرام پر عمل کرتا ہے تو اس کے لیے پلوٹونیم کا

حصول لازمی ہوگا۔ اسے یہ یقین نہ تھا کہ پاکستان یورینیم کو افزودہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو چکا ہے جس کی مدد سے فوری ہتھیاروں کی تیاری ممکن ہے۔

ری پروسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ

جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے سلسلے میں دو ہی طریقے موجود ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ بم بنانے کی غرض سے فزائل میٹریل کو یورینیم کی افزودگی کے ذریعے استعمال کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسرے طریقے میں فیول کو نیوکلیئر پاور ری ایکٹر سے ری پروسس کرنے کے بعد پلوٹونیم بم کی تیاری ممکن ہوتی ہے۔ بہرکیف مغربی سائنس دانوں کا بالعموم یہ خیال تھا کہ کوئی بھی غیر مغربی ملک اس صلاحیت کا حامل نہیں کہ اپنا یورینیم افزودہ کرنے کا پروگرام از خود تیار کر سکے۔ چناں چہ یہی سبب اور وجہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے اواخر تک پلوٹونیم کو ہی جوہری بم کی تیاری میں اہم ترین دھات کی حیثیت حاصل تھی اور اسی لیے اس کی نگرانی اور جانچ پڑتال کا نظام بھی کافی سخت تھا۔ اس بات پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی کہ کوئی ترقی پذیر ملک ایٹمی ری ایکٹر اور ری پروسیسنگ پلانٹ کہیں سے بھی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس وقت تک پلوٹونیم کو پاکستان کی اہم ترین ضرورت تصور کیا جاتا تھا جو ایٹم بم کی تیاری کے لیے نہایت ناگزیر تھا۔ ری ایکٹر پہلے ہی سے موجود تھا جو ۱۹۷۲ء سے کراچی میں کام کر رہا تھا۔ اگر پاکستان کو ری پروسیسنگ پلانٹ بھی مل جاتا تو اس کی مدد سے ہر سال پندرہ سے بیس ایٹم بم تیار کیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۷۳ء میں پاکستان اور فرانس کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے مطابق فرانس کی ایک کمپنی کو ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ پاکستان کو فراہم کرنا تھا۔ تاہم مئی ۱۹۷۴ء میں بھارت کے ایٹمی دھماکے نے بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ اچانک پوری دنیا اس دھماکے سے بیدار ہو گئی۔ دنیا کی ترقی یافتہ ایٹمی طاقتوں نے اس امکان پر غور و خوض شروع کر دیا کہ دنیا کے ترقی پذیر ممالک بھی ترقی یافتہ ملکوں سے ملنے والی نیوکلیئر پاور

ٹیکنالوجی کی مدد سے ایٹمی ہتھیار تیار کر سکتے ہیں۔ چناں چہ ان ممالک کو جوہری ٹیکنالوجی کی مدد سے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری سے روکنے کے لیے ''لندن کلب'' کا قیام عمل میں آیا جسے بعد ازاں نیوکلیئر سپلائرز گروپ کا نام دیا گیا۔ اس کلب نے ان تمام ترقی یافتہ ممالک پر یہ پابندی عائد کردی کہ وہ کسی بھی ملک کو جوہری ٹیکنالوجی، معلومات اور مواد اور ساز و سامان فراہم نہیں کریں گے، چناں چہ لندن کلب کے قیام کے نتیجے میں فرانس نے پاکستان کو ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ دینے کا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ فرانس سے ری پروسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ منسوخ ہونے کے بعد پاکستان کے لیے ایک دروازہ ضرور بند ہو چکا تھا اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کی تیاری کا پروگرام بھی کافی متاثر ہوا تھا لیکن درحقیقت یہی وہ لمحہ تھا جب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے اصلی جوہر کھلنے والے تھے۔ وہ یورینیم کی افزودگی کے تکنیکی عمل کی نہ صرف پوری جانکاری رکھتے تھے بلکہ اس ٹیکنالوجی پر انھیں مکمل گرفت اور مہارت حاصل تھی۔ چناں چہ اب پاکستان کے لیے واحد راستہ یہی تھا کہ پلوٹونیم کے بجائے یورینیم کی افزودگی کے ذریعے اپنے جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ یہ طریقہ کار نسبتاً زیادہ سادہ اور آسان بھی تھا۔ اس زمانے میں بھی بہت سے ممالک کو یہ شبہ تھا کہ پاکستان یورینیم افزودگی کا پروگرام تیار کرنے کا اہل ہو سکتا ہے؟؟؟ یہ شکوک اور شبہات صرف مغربی ممالک ہی میں موجود نہ تھے بلکہ تین افراد پر مشتمل وہ بورڈ بھی جو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سرگرمیوں کی نگرانی پہ مامور تھا اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ بہرنوع ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ان سب کو بالآخر غلط ثابت کر دکھایا۔

جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی پالیسی سے انحراف

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بہت جلد اس طریقے کو دریافت کر لیا جس کے ذریعے'' جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی پالیسی اور دباؤ سے واضح طور پر انحراف کے قابل

ہو سکتے تھے اور اس پورے نظام کو تہ و بالا کر سکتے تھے۔ یہی وہ طریقہ تھا جسے وہ زندگی بھر استعمال کرتے رہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ ''مکمل افزودگی کرنے والے پلانٹس'' کی خریداری کا خیال حقیقت پسندی پر مبنی نہیں ہے۔ یہ بہت جلد ظاہر ہو جانے والا منصوبہ ہے جس پر فوراً پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں، چناں چہ یورینکو میں اپنی ملازمت کے دوران حاصل ہونے والا تجربہ ان کے بہت کام آیا۔ وہاں کام کرنے کے دوران انھیں بہت اچھی طرح سے معلوم ہو چکا تھا کہ جدید ترین سینٹری فیوج ماڈل تشکیل دینے کی غرض سے اس کے ضروری اجزاء، پرزے، ساز و سامان اور دیگر اشیاء کہاں کہاں سے اور کس کس سے مل سکتی ہیں لہٰذا اگر وہ ان پرزوں اور اجزاء کو براہِ راست فراہم کنندہ سے یا پھر کسی درمیانی شخص کے ذریعے حاصل کر لیں تو ایسی صورت میں مغرب کی انٹیلی جنس ایجنسیاں اس کا سراغ نہیں لگا پائیں گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یورپین فراہم کنندگان کے جذبۂ حرص کی تسکین بھی ہو سکے گی جو بھاری رقومات کے عوض یہ حساس نوعیت کا سامان انھیں بلا کسی تفتیش اور تحقیق کے فراہم کرنے پر بہرصورت آمادہ رہیں گے۔ انھیں اس بات سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہوگی کہ یہ پرزے، اجزاء اور ساز و سامان کس مقصد سے حاصل کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر یہ راز آشکار ہو چکا تھا کہ تجارتی اور کاروباری منفعت انگیزی، حرص اور طمع اس معاملے میں ان کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوں گے۔ چناں چہ اس حقیقت میں کسی بھی شک اور شبے کی قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں ہے کہ کہوٹہ کی ریسرچ لیبارٹری میں موجود تمام کا تمام ساز و سامان پرزے، اجزاء اور دیگر ہر قسم کا مواد جسے پاکستان کے ایٹم بم اور ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال کیا گیا ہے وہ سب کا سب یورپ ہی سے درآمد کیا گیا ہے۔ یورپ سے درآمد کردہ اس ساز و سامان، اوزار، پرزوں اور اجزاء کی مدد سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنا شہرہ آفاق نیٹ ورک قائم کیا۔ جس کا اصل آغاز ۱۹۷۰ء کے

اواخر میں ہوا تھا اور جسے آنے والے عرصے میں ڈاکٹر خان کے جوہری پھیلاؤ کے نیٹ ورک کی اہم ترین بنیاد ثابت ہونا تھا۔ اسی زمانے کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو تازہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پاکستان کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہا تھا:

"وہ ملک جو ڈھنگ سے کپڑا سینے کی سوئی تک نہیں بنا سکتا تھا اچھی اور پائیدار سائیکلیں اور معمولی نوعیت کے مگر دیرپا لوہے کے سریے تک تیار کرنے کا اہل نہ تھا، اس ملک نے اب دنیا کی جدید ترین اور انتہائی دشوار جوہری ٹیکنالوجی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔" آگے چل کر انھوں نے مزید بتایا "ہم نے ایک ایسی منصوبہ بندی کی تھی جس کے ذریعے ہم اپنی ضرورت کی ہر شے کھلی مارکیٹ سے خرید سکتے تھے تاکہ ایک اچھے ڈھانچے کی تعمیر کے لیے مضبوط بنیاد فراہم ہو سکے اور ہم جب چاہیں ایٹمی ہتھیار تیار کر سکیں۔ یورپ میں طویل عرصے تک قیام کے دوران متعدد ایسے ممالک کے بارے میں معلومات کا حصول اور ان کی متعلقہ مینوفیکچرنگ کمپنیوں کے بارے میں مکمل اطلاعات میرے لیے ایک بیش قیمت سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔"

امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی تاریخی دھمکی

پاکستان کے جوہری بم اور ہتھیاروں کے پروگرام کا سہرا تمام تر سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے سر ہے جو پاکستان کو ہر قیمت پر اور ہر صورت میں ایک ایٹمی طاقت بنانے کے خواہش مند تھے۔ تاہم ایٹم بم کے حصول کا یہ خواب پاکستان کے پرتشدد اور بحرانی سیاسی حالات کے نتیجے میں اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ پاکستان کی انتہائی طاقتور مسلح افواج سے بھٹو کے اختلافات روز بروز بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے دوران بھٹو کی سیاسی پارٹی پر دھاندلی کے الزامات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں داخلی شورش، بے اطمینانی، سیاسی بحران اور بدنظمی نے جڑ پکڑ لی جس کا خاتمہ بالآخر بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس

زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو اکثر و بیشتر یہ کہا کرتے تھے کہ امریکی حکومت اور امریکی انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے نے ان کے خلاف فوجی بغاوت میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے اور انھیں جوہری ہتھیاروں کی تیاری اور امریکا کے روبرو سر نہ جھکانے کی سزا اور پاداش میں ایک فوجی جنرل کو ان کے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ بھٹو بسا اوقات یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگست ۱۹۷۶ء میں اپنے دورۂ پاکستان کے موقع پر سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے انھیں لاہور کے گورنر ہاؤس میں ایک تقریب کے دوران یہ دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے پاکستان کے جوہری پروگرام کو ترک اور مسترد نہ کیا تو وہ میری ذات کے حوالے سے ایک بھیانک ترین مثال قائم کر دیں گے تاکہ آئندہ پھر کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکے کہ وہ جوہری پروگرام کی بات بھی کر سکے۔

بہر کیف! بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت کے بعد برسر اقتدار آنے والے طالع آزما جنرل ضیاء الحق نے کبھی اس بات کا کوئی عندیہ یا اشارہ نہیں دیا کہ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ترک کرنے کے خواہش مند ہیں یا پھر اس پالیسی میں کسی تبدیلی یا ترمیم کے خواہاں ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ پوری قوم اس خیال سے متفق تھی کہ پاکستان کے تحفظ اور سلامتی کے لیے جوہری بم اور ہتھیاروں کا حصول ناگزیر ہے۔ چناں چہ اس پالیسی سے سرمو انحراف کرنا ضیاء الحق کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ بہر طور بھٹو کے زوال کے بعد اب ایٹمی پروگرام براہ راست پاکستان کی مسلح افواج کے کنٹرول میں آ چکا تھا اور آج تک ملک کے ایٹمی پروگرام پر مسلح افواج کا یہ تسلط اور کنٹرول پوری قوت طاقت کے ساتھ قائم ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی زوال کا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بھی بے حد رنج تھا کیوں کہ وہی ڈاکٹر خان کو پاکستان لانے کے ذمہ دار تھے چناں انھوں نے جنرل ضیاء سے بھٹو کی جان بخشی کی درخواست بھی کی تھی جسے قبول نہیں کیا گیا اور بالآخر ۱۹۷۹ء میں

انھیں پھانسی دے دی گئی۔ بہرصورت ڈاکٹر عبدالقدیر خان پاکستان کے لیے چوں کہ غیر معمولی قدر و قیمت کے حامل تھے لہٰذا ان کی موجودہ اور آئندہ گراں قدر خدمات کے پیش نظر ان کی موجودگی بھی ضروری تھی تاکہ وہ اپنا منفرد کردار ادا کر سکیں۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی طاقت اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جوہری ہتھیاروں کی تیاری اور ان کا حصول ہر شے پر مقدم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اب ہر معاملے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھے۔ کہوٹہ کو "ریاست کے اندر ریاست" کا درجہ حاصل ہو چکا تھا جس کے غیر متنازع لیڈر ہونے کا شرف ڈاکٹر خان کو حاصل تھا۔ خان ریسرچ لیبارٹریز اپنے وجود میں خود ایک الگ دنیا تھی جو آہستہ آہستہ ایک چھوٹے سے شہر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ یورینیم کو افزودہ کرنے کے ابتدائی کام سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کے آر ایل کی سرگرمیوں کا رُخ روایتی ہتھیاروں اور اسلحے کی فروخت کی سمت موڑ دیا اور پاکستان کی مسلح افواج کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر ممالک کو بھی یہ ہتھیار فروخت کیے جانے لگے۔ بہرکیف! جوہری ہتھیاروں کی تیاری سے لے کر روایتی ہتھیاروں کی فروخت تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے کام کی نوعیت وہیں سے زیادہ اکتسابی نوعیت کی تھی۔ چناں چہ وہ بسا اوقات عوامی جمہوریہ چین سے ضروری ساز و سامان خرید کر اسے اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے۔ ان کا ادارہ سیاسی کنٹرول سے آزاد ضرور تھا لیکن پاکستان کے فوجی، صنعتی کمپلیکس سے وہ بڑی گہرائی کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور افواج، حکومتی انجینئرز، سائنس دانوں اور ٹھیکے داروں سے اس کے انتہائی قریبی تعلقات قائم تھے۔ پاکستان میں ملٹری کو ملکی حکومت اور معیشت میں ایک اہم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اس نے کاروبار اور تجارت میں بھی قدم رکھ دیا تھا جس کے نتیجے میں اسے اضافی آمدنی بھی ہو رہی تھی۔

عبدالقدیر خان ریسرچ لیبارٹری بھی افواج پاکستان کی "کاروباری اور تجارتی سلطنت" کا ایک اہم اور ناگزیر حصہ تھی۔ خود ڈاکٹر خان کے ایک دعوے کے مطابق ان کے اس ادارے میں چھ ہزار انجینئرز اور سائنسدان کام کیا کرتے تھے جنھوں نے ۳۵۰ ملین ڈالر مالیت کے میزائل اور بارودی سرنگیں تیار کی تھیں اس کے علاوہ "کے آر ایل" زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل، ٹینک شکن سسٹم اور راکٹ لانچرز بھی تیار کر کے فروخت کر رہا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر خان کا اصل اور بنیادی کام یورینیم کی افزودگی ہی سے متعلق تھا لیکن وہ پاکستان کے ایٹم بم کے خالق کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہو گئے۔ اس بات میں کتنی اور کس حد تک صداقت موجود ہے اور کیا اسے ایک افسانوی شاہ کار کا شاندار اقتباس قرار دیا جا سکتا ہے اس کے بارے میں ان کے مخالفین کی رائے یہ ہے کہ ایٹم بم کی تیاری میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ذاتی حصہ اور کنٹری بیوشن پانچ فیصد سے ہرگز زیادہ نہیں ہے۔ سینکڑوں، ہزاروں سائنسدانوں نے پاکستانی ایٹم بم کی تخلیق میں جو شبانہ روز کاوش اور محنت کی تھی، اسے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنے کھاتے میں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔!!! بہرکیف یہ امر آج تک ایک سربستہ راز ہے کہ پاکستانی ایٹم بم کا اصل اور حقیقی خالق کون ہے؟؟؟ تاہم ان تلخ مباحث سے قطع نظر اس متنازع معاملے سے ڈاکٹر خان کی آئندہ سرگرمیوں کا سراغ ضرور مل سکتا ہے۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام اور عوامی جمہوریہ چین

ذوالفقار علی بھٹو سے ۱۹۷۶ء میں ہونے والے معاہدے کے بعد عوامی جمہوریہ چین کو پاکستان کے جوہری پروگرام کے سلسلے میں ایک اہم شراکت دار کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ چناں چہ جوہری پھیلاؤ کے ایک تجزیہ کار گیری ملہوتن کا کہنا ہے کہ اگر پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے چین کی امداد اور تعاون کو خارج کر دیا جائے تو پاکستانی

ایٹمی پروگرام نام کی کوئی چیز سرے سے موجود نہ ہوتی۔ بہرنوع جنرل ضیاء الحق کے دورِ اقتدار میں عوامی جمہوریہ چین سے تعلقات برقرار تھے اور اپریل ۱۹۸۴ء میں چینی صدر نے پاکستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشرے کے دوران یہ بات بغیر کسی شک وشبے کے کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت تک پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین حکومتی اور سرکاری سطح پر باقاعدہ ایک باہمی معاہدہ موجود تھا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان وہ کلیدی شخصیت تھے جو ان دونوں ممالک کے مابین ہونے والی بات چیت، معاملات اور دیگر امور میں درمیانی کردار ادا کرتے رہے تھے۔ بظاہر تو یہ معاہدہ دو حکومتوں اور دو ممالک کے درمیان تھا لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے دیگر افراد اور اداروں سے بھی بے شمار روابط تھے چنانچہ انھوں نے وسیع تر تعلقات کے پیش نظر اپنے سارے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ چین ڈاکٹر خان کے توسط سے پاکستان کو جوہری پروگرام کی تکمیل میں پوری مدد فراہم کر رہا تھا اور اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں چین کے کئی سفر بھی کیے تھے جس میں وہ سفر بھی شامل ہے جو انھوں نے جوہری ہتھیاروں کی ''ڈیزائن ٹریننگ'' کی غرض سے کیا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو عوامی جمہوریہ چین وہ ملک ہے جس سے حاصل ہونے والے جوہری رازوں اور حساس معلومات کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے فروخت کرنے کی ابتداء کی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اس انوکھی اور منفرد جوہری تجارتی سلطنت کی بنیاد چین سے حاصل کردہ جوہری رازوں پر رکھی گئی تھی۔ ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کے عشرے کی ابتدا تک عوامی جمہوریہ چین، مغرب کی جوہری ٹیکنالوجی کی معلومات کے حصول کی غرض سے کوشاں رہا تھا یہاں تک کہ اس نے ایرانی حکومت سے ان معاہدوں کی نقل بھی طلب کرلی تھی جو ایران نے مغربی ممالک سے کیے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ یورینکو میں ملازمت کے دوران انھوں نے جو ڈیزائن حاصل کیے

تھے وہ دیگر ممالک کو بھی دیے جاسکتے ہیں۔ عالمی مارکیٹ میں انھیں خاصا اعتبار اور اعتماد حاصل ہو چکا تھا جس کا وہ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ دوسری طرف عوامی جمہوریہ چین کے پاس سینٹری فیوج کے ذریعے یورینیم کی افزودگی کا پروگرام کافی کمزور تھا اور اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تعاون اور مدد درکار تھی۔ عوامی جمہوریہ چین اس بات کا بھی خواہش مند تھا کہ دنیا میں جوہری طاقتوں کی موجودہ تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے اور خصوصی طور پر اس کا حریف ملک بھارت جو پہلے ہی ایٹمی طاقت بن چکا تھا اسے فاصلے پر رکھنے کی غرض سے بھی یہ ضروری تھا کہ پاکستان کو جوہری طاقت بننے میں پوری مدد فراہم کی جائے۔ اس مقصد سے چینی سائنس دان کہوٹہ بھی آئے تھے۔ ڈاکٹر خان پاکستان میں اپنے کیریئر کے خاتمے تک بدستور عوامی جمہوریہ چین کے مسلسل دوروں پر جاتے رہے۔ بہرنوع اس بارے میں ضروری معلومات اور تفصیلات صیغہ راز ہی میں ہیں کہ چین کو ان کی سرگرمیوں سے کوئی آگاہی تھی یا نہیں۔ یا پھر چینی حکومت بھی ان کی سرگرمیوں میں برابر کی شریک تھی؟؟ ان تمام حقائق اور واقعات کے باوجود ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ انھوں نے عوامی جمہوریہ چین سے ڈیزائن سمیت کوئی اور مدد بھی حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم ایک بم برگر بھی تیار کرتے ہیں تو اہل مغرب اسے مکڈونلڈ کی نقل سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

۱۹۸۳ء میں امریکی سی آئی اے نے پاکستان کو وارننگ دینا شروع کر دی تھی کہ عوامی جمہوریہ چین پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں بھرپور مدد دے رہا ہے۔ شروع شروع میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ چین کراچی کے پاور ری ایکٹر کے لیے پاکستان کو مدد فراہم کر رہا ہے لیکن امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی جانب سے جاری ہونے والی ایک خفیہ نوعیت کی یادداشت میں یہ کہا گیا ''اب ہمیں اس بات کا مکمل یقین ہو چلا ہے کہ چین اور پاکستان کے مابین یہ تعاون اور اشتراک فزائل میٹریل پروڈکشن کے شعبے میں ہو رہا ہے جس کا

مقصد جوہری ہتھیاروں کی ڈیزائننگ سے ہوسکتا ہے۔" اس یادداشت کے نتیجے میں چین، امریکا جوہری تعاون کا معاہدہ تعطل کا شکار ہوگیا۔ ڈاکٹر خان کے ایجنٹ چینی ہتھیاروں کے ڈیزائن ہمراہ لے کر یورپی ممالک کا دورہ کرتے رہتے تھے تاکہ ان ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال والے پرزے، اجزاء اور دیگر ضروری ساز وسامان وہاں سے خرید سکیں۔ ان سرگرمیوں کی بھنک، امریکی انٹیلی جنس کو بھی پڑ گئی چناں چہ پاکستان کے خفیہ عزائم اب کوئی راز نہ رہے۔ چینی جوہری ہتھیاروں کے ڈیزائن، اس جنگ میں بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ہر طرح سے مدد کرسکتے تھے جو ان کے اور پاکستان کے اٹامک انرجی کمیشن کے مابین جاری تھی جو خود اپنے طور پر ہتھیار تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر خان کی اہمیت اور شہرت کو مزید استحکام بھی حاصل ہوسکتا تھا۔

کہوٹہ میں یورینیم کی افزودگی کا کھلم کھلا اعلان

۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ "کہوٹہ میں واقع خان ریسرچ لیبارٹریز میں یورینیم کی افزودگی کا کام زور و شور سے جاری ہے تاہم اس کا جوہری ہتھیاروں کی تیاری سے کوئی تعلق نہیں ہوگا حالاں کہ ضرورت پڑنے پر نہایت مختصر وقت میں یہ ہتھیار بھی تیار کیے جاسکتے ہیں۔"

بھارت کی براس ٹیکس فوجی مشقیں

رفتہ رفتہ پاکستان یورینیم افزودگی کے نتیجے میں جوہری بم اور ہتھیار تیار کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہوگیا۔ چناں چہ ۱۹۸۷ء سے پاکستان نے اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کی رفتار مزید تیز کردی، جس کا ایک جزوی سبب یہ بھی تھا کہ بھارت نے براس ٹیکس کے نام سے پاکستانی سرحدوں کے قریب اپنی فوجی مشقوں کا آغاز کردیا تھا۔ پاکستان نے بھارت کے اس اقدام کو نہایت خطرناک قرار دیتے ہوئے ممکنہ جنگ کا ایک اشارہ قرار دے دیا۔ خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بھی اس معاملے میں اظہار خیال

ضروری سمجھا اور ایک اخباری انٹرویو میں یہ چونکا دینے والا انکشاف کیا کہ "اب تک امریکی سی آئی اے پاکستانی ایٹم بم کے حوالے سے جو کچھ کہتی آرہی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کبھی ایٹم بم بنانے کی صلاحیت حاصل نہیں کرسکے گا لیکن شاید انھوں نے میری صلاحیتوں اور اہلیت کا درست اندازہ نہیں لگایا تھا۔ اب انھیں یہ بھی پتہ چل گیا ہوگا کہ پاکستان ایٹم بم بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اس شیخی کے نتیجے میں زبردست تہلکہ مچ گیا۔ ظاہر ہے سب سے زیادہ تشویش امریکی حکومت اور انتظامیہ ہی کو لاحق ہوچکی تھی جو کانگریس کو مسلسل یہ یقین دہانی کراتی آرہی تھی کہ ایسی کوئی علامت موجود نہیں کہ پاکستان نے ایٹم بم بنالیا ہے۔ ڈاکٹر خان سے بھی حکومت نے کہا کہ وہ فوری طور پر اپنے یہ ریمارکس واپس لے لیں تاہم پاکستانی حکام نے آئندہ چل کر اس حقیقت کا اعتراف کرلیا کہ ۱۹۸۷ء میں پاکستان ایٹم بم بناچکا تھا۔

پاکستانی ایٹمی پروگرام پر فوج کا براہِ راست کنٹرول

اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل محمد ضیاء الحق طیارے کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ نومبر ۱۹۸۸ء میں عام انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں پاکستان پیپلز پارٹی کی قائد محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوگئیں۔ اس سے قبل پاکستان کا ایٹمی پروگرام جنرل ضیاء الحق کے دور تک حکومت کے کنٹرول میں رہا تھا، جب تک ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم رہے ڈاکٹر عبدالقدیر خان براہِ راست انھیں جواب دہ تھے۔ ضیاء الحق کے دور تک بھی یہ سلسلہ بدستور جاری تھا اور ڈاکٹر خان صدر مملکت کو براہِ راست رپورٹ کیا کرتے تھے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک مرتبہ یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ آج تک کسی بھی پاکستانی حکومت نے ان کے کام میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ یہ ایک قومی پروجیکٹ ہے لہٰذا کسی بھی حکومت نے ان کی راہ میں بھی

کسی قسم کی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔'' لیکن بے نظیر بھٹو کے وزیر اعظم بننے کے بعد
صورتحال تبدیل ہو چکی تھی۔ بے نظیر بھٹو کا پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے اب براہ
راست تعلق نہ رہا تھا۔ اس کی پیش رفت پر بھی انھیں کوئی مکمل اختیار نہ تھا۔ جنرل ضیاء
الحق کی موت کے بعد طاقت کا ایک نیا ڈھانچا وجود میں آ چکا تھا جسے ٹرائیکا بھی کہا جاتا
ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ٹرائیکا تین افراد پر مشتمل تھا یعنی صدر پاکستان، وزیر اعظم پاکستان
اور آرمی چیف۔ اب یہ تینوں افراد باہمی طور پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے نگران
تھے۔ وزیر اعظم بے نظیر تھیں۔ صدر پاکستان غلام اسحٰق خان اور آرمی چیف مرزا اسلم بیگ
تھے۔ تاہم غلام اسحٰق خان سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے تعلقات انتہائی ذاتی نوعیت کے
تھے کیوں کہ غلام اسحٰق خان ۱۹۷۰ء کے عشرے سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے
متعلق رہے تھے۔ چناں چہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''غلام اسحٰق خان نے
پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی حفاظت ایک چٹان بن کر کی ہے، حکومتیں آتی رہیں اور جاتی
رہیں لیکن وہ ہمیشہ پاکستانی ایٹمی پروگرام کو تحفظ دیتے رہے۔ وہ ہر ماہ کہوٹہ آیا کرتے تھے
تا کہ ہماری پیش رفت کا جائزہ لے سکیں۔ لہٰذا اس قربت اور رفاقت کے نتیجے میں انھیں
صدر غلام اسحٰق خان کی مکمل اور بھرپور تائید وحمایت حاصل تھی لیکن بدلی ہوئی صورتحال
میں اب پاکستان کی مسلح افواج کو ایٹمی پروگرام کی پیش رفت پر براہ راست کنٹرول
حاصل ہو چکا تھا اور بعض اوقات وزیر اعظم پاکستان کو بھی اس معاملے سے قطعی طور پر بے
خبر رکھا جاتا تھا۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر ٹرائیکا کی نگرانی کے باوجود یہ طے نہیں تھا
کہ اس پروگرام پر حتمی اتھارٹی اور اختیار کے حاصل ہے؟؟؟ اس صورتحال کے نتیجے میں
ڈاکٹر خان کو مزید آزادی ملتی چلی گئی اور وہ ٹرائیکا کے تینوں مختلف نگرانوں کے باہمی
اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکالتے گئے۔ آگے چل کر اس ٹرائیکا کے تینوں
ارکان کے مابین سبقت اور برتری کے لیے باقاعدہ رسہ کشی شروع ہو گئی تھی اور چوں کہ

ایٹمی پروگرام کو پاکستان کے تحفظ اور سلامتی کے حوالے سے انتہائی ترجیحی اہمیت حاصل
تھی لہٰذا اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی اس پروگرام پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کی
کوشش کرتا تو دوسرے ارکان اسے اپنی اتھارٹی کے لیے خطرہ سمجھ کر اس کی شدت سے
مزاحمت شروع کر دیا کرتے تھے۔ بہرنوع یہ صورت حال ڈاکٹر خان کے لیے نہایت
سازگار ثابت ہوئی اور وہ بدستور اپنے ہدف کے مطابق کام میں لگے رہے۔

۱۹۸۹ء...... پاکستان کی وزیر اعظم کا دورۂ امریکا

۱۹۸۹ء میں وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کو امریکا کے دورے پر روانہ ہونا تھا۔
امریکی انٹیلی جنس کے ماہرین کو بھی یہ اطلاعات مل چکی تھیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام
پر بے نظیر بھٹو کو حقیقی کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ چناں چہ ان کی امریکا آمد سے قبل امریکی
سی آئی اے کے تجزیہ نگاروں نے ایک خفیہ دستاویز میں اس رائے کا اظہار کر دیا تھا کہ
بے نظیر بھٹو کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے ضمن میں کسی بھی قسم کی فیصلہ کن حیثیت
حاصل نہیں ہے اور مستقبل قریب میں بھی اس کی کوئی امید نہیں نظر آتی۔ اس کی بنیادی
وجہ شاید یہ رہی ہو کہ عام انتخابات سے قبل بے نظیر بھٹو اپنے اعلانات اور بیانات کے
ذریعے اس بات کا عندیہ اور اشارہ دیتی رہی تھیں کہ اگر وہ برسر اقتدار آ گئیں تو پاکستان
کے ایٹمی پروگرام کی رفتار کو سست کر دیں گی تا کہ امریکی امداد اور تائید وحمایت کا تسلسل
جاری و برقرار رہ سکے۔ جبکہ افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے بعد امریکی امداد
میں بھی کافی کمی آ چکی تھی۔ ان کی ایسی باتوں نے یقیناً مسلح افواج میں اس شک وشبے کو
پیدا کر دیا ہوگا کہ وہ برسر اقتدار آنے کے بعد ایٹمی پروگرام پر سودے بازی کر لیں گی
جس میں وزیر اعظم خود، جنرل اسلم بیگ، صدر غلام اسحٰق خان اور ڈاکٹر خان موجود تھے۔
بے نظیر بھٹو نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ فزائل میٹریل کی پیداوار کو فی الفور بند کر دیا جائے
تا کہ وہ امریکی حکومت کو یہ باور کرا سکیں کہ پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام رول بیک

کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اس میٹنگ میں پیش کی جانے والی تجویز نے اس بات کو مزید تقویت بخش دی کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے گا۔ امریکی انٹیلی جنس اداروں نے امریکی حکومت اور انتظامیہ کو یہ اطلاعات بھی فراہم کی تھیں کہ بے نظیر بھٹو نے پاکستانی فوجی حکام اور دیگر اداروں کو یہ ٹھوس یقین دہانی کرادی ہے کہ اگر وہ برسر اقتدار آ گئیں تو جوہری پالیسی، افغان پالیسی اور مسلح افواج کی داخلی پالیسیوں میں کسی بھی قسم کی کوئی مداخلت ہرگز نہیں کریں گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی کہوٹہ میں واقع ''کے آر ایل'' کے معائنے کے لیے بھی نہیں گئیں۔ حالاں کہ ان پر ایسی کوئی قدغن نہیں تھی لیکن انھیں معلوم تھا کہ فوجی حکام کبھی اس معائنے کی اجازت انھیں نہیں دیں گے لہٰذا انھوں نے کبھی اس کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی۔

امریکی سی آئی اے کی وزیر اعظم پاکستان کو بریفنگ

امریکا کے سرکاری دورے میں امریکی سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم ایچ ویبسٹر نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے لیے ایک بریفنگ کا اہتمام کیا تا کہ انھیں معلوم ہو سکے کہ امریکی سی آئی اے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بابت کتنی باخبر ہے۔ انھیں وہائٹ ہاؤس کے بالمقابل واقع بلیئر ہاؤس لے جایا گیا جہاں سی آئی اے کے چیف نے وزیر اعظم پاکستان کو ان کے جوہری ہتھیاروں کے پروگرام کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس بریفنگ کے دوران بے نظیر بھٹو کو پاکستان کے ایٹم بم کا ماڈل بھی دکھایا گیا۔ بے نظیر بھٹو کے لیے یہ حقائق اور واقعات خاصے چونکا دینے والے تھے جنھیں سن کر وہ ششدر رہ گئیں۔ امریکی سی آئی اے کو پاکستانی وزیر اعظم کی بہ نسبت پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے کہیں زیادہ آگاہی تھی۔ انھوں نے کبھی پاکستانی بم کی شکل تک نہیں دیکھی تھی جو اب ایک ماڈل کے روپ میں انھیں دکھایا جا رہا تھا۔

تنازع کشمیر...... سرحدوں پر فوجوں کا اجتماع

۱۹۹۰ء کے موسم بہار میں تنازع کشمیر کے سلسلے میں بھارت کے ساتھ ایک بہت بڑے بحران نے سر اٹھایا۔ سرحد کی دونوں جانب افواج کا بھاری اجتماع دیکھنے میں آیا۔ پاکستان کے آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ نے ایرانی حکومت کی تائید و حمایت سے سرشار ہو کر امریکی انتظامیہ کی خواہشات کے برخلاف یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ کشمیر اور ایٹمی پروگرام کے حوالے سے پیش رفت کے سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ چناں چہ ۱۹۸۹ء میں بے نظیر بھٹو کے دورۂ امریکا کے موقع پر یورینیم کی افزودگی کے جس پروگرام کو روک دیا گیا تھا اسے دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ فزائل میٹریل کی پیداوار کے سلسلہ کا بھی از سر نو آغاز کر دیا گیا۔ پاکستان اور بھارت کے مابین تناؤ اور کشیدگی کے عروج پر پہنچنے کے بعد یہ اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ پاکستان کے آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ نے بالآخر ''ایک جوہری ہتھیار'' کی تیاری کی منظوری دے دی ہے۔ سیٹلائٹ پر موصول ہونے والی تصویروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پاکستان اس جوہری ہتھیار کو بھارت کے خلاف استعمال کرسکتا ہے۔ چناں چہ امریکی حکام نے صدر پاکستان غلام اسحٰق خان کو براہ راست یہ دھمکی دی کہ اگر انھوں نے جنرل اسلم بیگ جیسے عقاب صفت جنرلوں کی بات پر عمل کیا تو شکست اور الگ تھلگ کیے جانے کے لیے تیار رہیں۔

اگست ۱۹۹۰ء...... بے نظیر بھٹو کی اقتدار سے معزولی

اگست ۱۹۹۰ء میں وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے معزول کر دیا گیا۔ اپنی معزولی کے بعد انھوں نے مختلف مواقع پر اسے اپنے خلاف ''جوہری بغاوت'' کا نام بھی دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں ان کی بڑھتی ہوئی مداخلت نے ان کی معزولی میں بنیادی کردار ادا کیا ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جوہری مسئلہ تو ان وسیع تر اختلافات اور تنازعات کا محض ایک جزوی حصہ تھا جو ان کے اور پاکستان کی مسلح افواج

کے مابین کافی عرصے سے چلے آ رہے تھے۔ بالخصوص پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی اور اس کے سربراہ جنرل حمید گل سے ان کی ایک پراسرار کشمکش اور جنگ جاری تھی۔ جنرل حمید گل نے ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بے نظیر بھٹو کو برسراقتدار آنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی لیکن ناکام رہے۔ تاہم آئی ایس آئی کے سربراہ کے عہدے سے علیحدگی کے بعد بھی انھوں نے بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے معزول کروانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ سابق پاکستانی سرکاری اہلکار حسین حقانی کے بقول جنرل حمید گل اور ان کے نائب نے مذہبی جہادیوں تک یہ پیغام پہنچایا تھا کہ بے نظیر بھٹو اپنے امریکی دورے میں امریکی حکومت سے یہ وعدہ کر کے آئی ہیں کہ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو فی الفور رول بیک کر دیں گی۔ افغانستان میں مجاہدین کو کامیابی سے ہمکنار ہرگز نہیں ہونے دیں گی اور کشمیر میں جہاد کے منصوبوں کا خاتمہ کر دیں گی۔ یہ وہ تین اہم ترین حساس اور نازک معاملات تھے جنھوں نے نہ صرف پاکستان کی اسٹریٹجک منصوبہ بندی میں نمایاں ترین کردار ادا کیا بلکہ ۱۹۹۰ء کے دوران پاکستان کے سیاسی راستے کا تعین بھی کر دیا تھا۔ ان تینوں مسائل اور معاملات کو پاکستانی مسلح افواج کی نظر میں ہمیشہ ترجیحی اہمیت حاصل رہی ہے، لہٰذا اس نے ان تینوں موضوعات کی بھرپور تائید و حمایت کی ہے چناں چہ افغانستان میں ایک ایسی طفیلی اسلامی حکومت کا قیام جو بھارت سے جنگ کی صورت میں پاکستان کو اسٹریٹجک گہرائی دینے کی اہل ہو ہمیشہ پاکستانی مسلح افواج کا ایک کلیدی اور ترجیحی نصب العین رہا ہے۔

پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی نے افغانستان میں جنگ لڑنے کی غرض سے مجاہدین کو اسلحہ اور تربیت فراہم کی تھی جو اب کشمیر میں مصروف جنگ مجاہدین کو بھی دی جاری تھی تاکہ بھارت کے خلاف وادیٔ کشمیر میں شورش، بغاوت اور افراتفری کو جنم دے سکیں۔

وادیٔ کشمیر میں ہونے والی شورش اور بغاوت بظاہر جنگجو گروپوں کی جانب سے جاری تھی لیکن ان کی پشت پر آئی ایس آئی ہی کا ہاتھ تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے ایٹم بم کو اسلامی ملت کے ایک شاندار کارنامے کی علامتی اہمیت حاصل ہو چکی تھی اور اسلامی عسکری گروپس خود کو اس ایٹمی پروگرام کا سرپرست تصور کرنے لگے تھے۔ اس احساس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ایک ''عظیم دیوتا'' کا روپ دے دیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے خود بھی نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے اس تصور اور امیج کو ایک ایسی شخصیت میں ڈھالنا شروع کر دیا جو پاکستان کے لیے نجات دہندہ اور محافظ کی حیثیت رکھتی ہو۔ چناں چہ ڈاکٹر خان نے اپنی شخصیت کے اردگرد جو طلسماتی اور کرشماتی ہیولہ کھینچ رکھا تھا اسے اسلامی عسکریت پسندوں اور مسلح افواج کے مخصوص حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی اور قبولیت حاصل ہو چکی تھی جس کے سبب ڈاکٹر خان ہمیشہ کسی بھی جانچ پڑتال، تحقیق اور تفتیش سے ماورا ہی سمجھے گئے اور جب ان کی مشکوک اور پراسرار سرگرمیوں کا انکشاف ہوا تب بھی ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جا سکا۔ خود ڈاکٹر خان بھی اپنی حیثیت، طاقت اور اثر و رسوخ کے بارے میں بڑی بڑی شیخیاں بگھارنے لگے تھے۔ چناں چہ بے نظیر بھٹو کی معزولی کے چند ہفتوں بعد راولپنڈی کے ایک فوجی ادارے میں سامعین سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہا تھا کہ ''انھوں نے بارہا آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ سے یہ کہا تھا کہ وہ بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے معزول کر دیں کیونکہ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی تکمیل میں رخنہ ڈال رہی ہیں۔''

پریسلر ترمیم کے تحت امریکی امداد پر پابندی

۱۹۹۰ء کے موسم بہار تک امریکی انٹیلی جنس اداروں کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہو چکا تھا کہ پاکستان ایٹمی صلاحیت کا حامل ہو چکا ہے۔ امریکی حکومت مستقل طور پر اس بات کی تصدیق کرتی چلی آ رہی تھی کہ پاکستان کے پاس کوئی ایٹم بم نہیں ہے جبکہ انٹیلی

جنس ذرائع اصل حقیقت سے باخبر ہو چکے تھے۔ بہر صورت ۱۹۹۰ء کے دوران پاکستان
اور بھارت کے مابین تنازع کشمیر پر ہونے والے بحران نے اس حقیقت سے پردہ
اٹھا دیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک اخباری انٹرویو میں اس بات کا اشارہ بھی دیا
چناں چہ بے نظیر بھٹو کی اقتدار سے معزولی کے دو ماہ بعد اکتوبر ۱۹۹۰ء میں اس وقت کے
امریکی صدر اور موجودہ صدر کے والد جارج ایچ ڈبلیو بش نے بالآخر پریسلر ترمیم کے
ذریعے پاکستان کو دی جانے والی امریکی امداد پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ جس کا جواز
انھوں نے یہ پیش کیا کہ وہ اب اس بات کی کوئی تصدیق اور توثیق کرنے کی پوزیشن میں
نہیں ہیں کہ پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت موجود نہیں!!! اس طرح امریکی
انتظامیہ اور پاکستان کے مابین گذشتہ کئی برس سے جاری اس سرد جنگ کا بالآخر خاتمہ
ہو گیا اور اب واشنگٹن کے پالیسی سازوں کے لیے پاکستان میں قطعاً کوئی دلچسپی باقی
نہیں رہی تھی، نہ ہی وہ پہلے کی طرح واشنگٹن کے لیے مزید کارآمد اور سود مند ثابت ہو سکتا
تھا۔ امریکی حکومت افغانستان کو بھی ہر اعتبار سے مکمل طور پر فراموش کر چکی تھی جبکہ اس
ملک پر کنٹرول اور حکومت کا قبضہ بھی اس وقت تک طے نہیں ہوا تھا۔ پاکستان کو ایف
۱۶ طیاروں کی فروخت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ چناں چہ ایسی صورت حال میں
پاکستان کے فوجی افسران اور سائنس دانوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ
امداد اور دوستوں کی تلاش میں اب انھیں کہیں اور دیکھنا پڑے گا۔ ایک پاکستانی سرکاری
اہلکار حسن عباس کا کہنا ہے کہ پاکستان نے افغانستان کے معاملے میں امریکی انتخاب کو
ہر ممکن تائید و حمایت اور امداد فراہم کی تھی۔ ہر مرحلے پر اس کا ساتھ دیا تھا لیکن جب
افغانستان کی خراب صورت حال کا ماجرا سامنے آ گیا تو امریکا نے پاکستان کو تنہا اور بے
یار و مددگار چھوڑ دیا۔ امریکا کی اس بے وفائی کے نتیجے میں پاکستان کو تین ملین افغان
مہاجرین کا بوجھ برداشت کرنا پڑا۔ ہزاروں کی تعداد میں دینی مدرسے سعودی عرب کی

حکومت کے پیسے سے پاکستان کے سرحدی علاقہ جات اور پنجاب میں خصوصیات کے
ساتھ کھلتے چلے گئے۔ کلاشن کوف کلچر پاکستان میں روشناس کرا دیا گیا۔ ایک گھنٹے کے
لیے کوئی بھی شخص محض دو ڈالر سے بھی کم رقم کے عوض کلاشنکوف کرائے پر حاصل کر سکتا
تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے سبھی بڑے شہروں میں ہیروئن کھلے عام فروخت
ہونے لگی تھی۔

پاک امریکا تعلقات کے نشیب و فراز

۱۹۹۰ء کے پورے عشرے کے دوران پاکستان اور امریکا کے باہمی اختلافات
نشیب و فراز کا شکار رہے لیکن دونوں ممالک کے درمیان حقیقی قربت کبھی ختم نہ ہو سکی۔
ایک مرحلہ تو ایسا بھی آیا جب واشنگٹن نے پاکستان کو کشمیر میں ہونے والی دہشت گردی
اور تشدد کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ پاکستانی حکومت نے یقین دہانی کرائی کہ وہ ان دہشت
گردوں کے خلاف انتہائی سخت اقدام کرے گا۔ ۲۰۰۱ء کے بعد امریکا میں دہشت گردی
کی تاریخی واردات کے بعد جب القاعدہ سے تعلق رکھنے والے جنگجوؤں کی تلاش کا مرحلہ
درپیش ہوا تو پاکستانی ذرائع نے امریکی حکومت سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ عسکریت
پسند جنگجو افراد بلند و بالا پہاڑی علاقوں میں چھپے ہوئے ہیں اور انھیں تلاش کرنا ہمارے
بس میں نہیں!!! ایک اور مرحلے پر امریکی حکومت کی جانب سے یہ کوشش بھی کی گئی کہ
کہوٹہ کو بین الاقوامی معائنے کے تحت دے دیا جائے تاہم پاکستان کے سیاسی حکمرانوں
نے باور کرایا کہ ایسا کوئی بھی اقدام انھیں پاکستان کی مسلح افواج کی نظروں میں انتہائی
کمزور، پست اور بزدل بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۹۰ء کے درمیانی حصے میں پاکستانی
حکومت کو وارننگ بھی دی گئی لیکن تعلقات بدستور سرد مہری کا شکار رہے کیونکہ پاکستان کی
داخلی اور اندرونی سیاست ایک ایسے بحرانی دور میں داخل ہو چکی تھی کہ جس میں سویلین
حکومتیں ایک کے بعد ایک مسلح افواج کی جانب سے معزول کی جا رہی تھیں۔ مسلح افواج

کی جانب سے ایسی معزول شدہ حکومتوں کو کرپشن کے الزامات لگا کر فارغ کر دیا جاتا
تھا۔ اس تمام اندرونی اور داخلی سیاسی افراتفری، بحران اور خلفشار کے باوجود عبدالقدیر
خان اور ان کا نیٹ ورک بدستور پروان چڑھ رہا تھا۔ ان کی طاقت، اثر و رسوخ اور
خودمختاری میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ وسیع تر اسٹریٹیجک مفادات نے ان کے
مخالفین اور دشمنوں کو ایک خاص فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے تمام برسوں میں
امریکی تعلقات کے پردے نے انھیں ایک ایسا تحفظ فراہم کر رکھا تھا جس کا پورا فائدہ
اٹھاتے ہوئے انھوں نے ایٹم بم کے ساتھ ساتھ اپنا نیٹ ورک بھی بڑی کامیابی کے
ساتھ قائم کر لیا تھا۔ بہرنوع امریکا کے ساتھ اسٹریٹیجک تعلقات کا شیرازہ بکھر جانے
کے بعد اب وہ مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہو چکے تھے۔ اب وہ اس معاملے میں قطعاً
آزاد تھے کہ جوہری ٹیکنالوجی کی جو صلاحیت اور اہلیت انھیں حاصل ہے اس کا سودا کہیں
بھی کسی سے بھی کر سکیں۔ امریکا کے ہاتھ کھینچ لینے اور پیچھے ہٹ جانے کے بعد اب انھیں
فری لائسنس مل چکا تھا کہ وہ اب اپنے لیے نئے شراکت دار تلاش کریں اور اپنا راستہ اپنی
سمت اور منزل بھی خود ہی طے کریں۔ چناں چہ ڈاکٹر عبدالقدیر نے اپنے لیے ایک نئے
راستے کا انتخاب کر لیا۔ انھوں نے اب تک اپنے حاصل کردہ علم، مہارت اور صلاحیتوں کو
ایک مکمل عالمی نیٹ ورک میں تبدیل کر دیا تھا اور اسے برآمد کرنے پر اپنی پوری توجہ
صرف کر دی تھی۔ اب وہ جوہری راز اور معلومات بیرون ملک برآمد کرنے لگے۔
''بین الاقوامی جوہری پھیلاؤ'' کو انھوں نے اپنی منزلِ مقصود قرار دے دیا تھا۔

فروری ۲۰۰۳ء میں آخرکار شکوک و شبہات، احتجاج اور تاخیر کے بعد بین الاقوامی
ایٹمی انرجی ایجنسی کے انسپکٹرز ایران میں داخل ہو گئے۔ یہ ٹیم تین اعلیٰ سطح کے اراکین پر
مشتمل تھی جنھیں ایرانی حکومت نے ہیلی کاپٹر فراہم کرنے کی پیشکش بھی کی، تاہم انھوں
نے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتے ہوئے بذریعہ

سڑک اپنی منزلِ مقصود کی سمت روانہ ہو گئے۔ صوبہ اصفہان اور کاشان کے وسطی حصے میں
واقع مقام ''نطنز'' ان کی منزلِ مقصود تھی جو رس بھری اور ناشپاتیوں کے باغات کی وجہ سے
پورے وسط ایشیا میں مشہور ہے۔ یہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی ہے جہاں مبینہ
طور پر نہایت خفیہ طریقے سے ایران کی جوہری طالع آزمائی کی کوششیں جاری تھیں۔ اس
واقعے سے چھ ماہ قبل ایران کے ایک مخالف گروپ نے پوری دنیا کو یہ انکشاف کر کے
حیرت زدہ اور ششدر کر دیا تھا کہ نطنز کے مقام پر ایرانی حکومت یورینیم کو افزودہ کرنے
کی غرض سے تنصیبات قائم کر رہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب سے لوگوں کے علم میں یہ
بات آئی کہ ایران بڑی مستعدی کے ساتھ یورینیم کو افزودہ کرنے کے پروگرام پر عمل
درآمد کر رہا ہے اور اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ آگے چل کر وہ ایٹم بم بنانے کی
بھی کوشش کرے۔ بین الاقوامی ایٹمی انرجی ایجنسی کا ایک انسپکٹر اولی جینونن جس کا تعلق
فن لینڈ سے تھا اس معائنہ ٹیم کا سربراہ تھا۔ یہ ذمہ داری ایران کے حوالے سے اس نے
چند ماہ قبل ہی لی تھی۔ بہرکیف! جینونن گذشتہ پانچ برس سے ایران کے معاملات سے
بے خبر تھا، چناں چہ جب اُس نے یہ ذمہ داری قبول کی اور متعلقہ دستاویزات اور
کاغذات اس کی نظر سے گزرے تو اسے اچانک ہی یہ احساس ہو گیا کہ ان پانچ برسوں
کے عرصے میں ایران جوہری طالع آزمائی کے راستے پر کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ اس
نے سیٹلائٹ پر موصول شدہ تصاویر بھی دیکھ لیں تا کہ اصل صورت حال کو سمجھ سکے لیکن
ان تصاویر سے کسی بھی طور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ان عمارات کے طویل سلسلے کے اندر کیا
چل رہا ہے۔ ان تصاویر سے محض یہ معلوم ہو رہا تھا کہ زیرِ زمین گہرائی میں بنکر کے اندر
بنائی گئی چند عمارات ہیں جنھیں طیارہ شکن توپوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ایرانی
حکومت کا کہنا تھا کہ یہ زرعی ریسرچ کی غرض سے تعمیر کردہ مرکز ہے تا کہ کسی بھی شک اور
شبے سے محفوظ رہا جا سکے۔

بہرکیف! اصل حقیقت اس وقت آشکار ہوگئی جب یہ انسپکٹرز نطنز پہنچ گئے۔ ایرانی حکام تین افراد پر مشتمل اس ٹیم کو اپنی ہمراہی میں ایک ایسے ہال میں لے گئے جو ایرانی سینٹری فیوج پروگرام کی مختلف تصاویر اور دستاویزات سے بھرا پڑا تھا۔ شیشے کے ایک صندوق میں سینٹری فیوج کا ایک نمونہ رکھا تھا جبکہ مختلف مقامات پر اس کے اجزائے ترکیبی کو نمائش کی غرض سے رکھا گیا تھا، یہ نمائش اس غرض سے کی جارہی تھی کہ ایران کے سیاسی لیڈروں کو دکھایا جائے کہ ان کا پیسا بالکل صحیح طریقے سے اور نہایت دانشمندی کے ساتھ خرچ ہورہا ہے۔ اب ان معائنہ کاروں کے علم میں یہ بات پوری طرح آچکی تھی کہ یہ کوئی غیر اہم سرگرمی اور کارروائی نہیں ہے۔ معائنہ ٹیم کے سربراہ اولی جینونن کو یہ سب کچھ دیکھ کر بے انتہا تعجب ہورہا تھا کہ اس اثناء میں ایران نے کتنی تیز رفتاری کے ساتھ جوہری آرزوؤں کی تکمیل کے راستے پر پیش قدمی کی ہے۔ بہرصورت اس ترقی اور تیز رفتاری کی اصل حقیقت اس پر تب واضح ہوئی جب وہ اس عمارت کے ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا بیان ہے کہ: ''جس لمحے میں نے اس کمرے میں اپنا قدم رکھا اور وہاں رکھے سازوسامان پر نظر ڈالی تو بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے! اوہ بوائے! یہ معاملہ کافی سنگین معلوم ہوتا ہے۔ اسے بڑی خوبی کے ساتھ منظم کیا گیا ہے۔'' چناں چہ یہ پروجیکٹ کوئی نیا نیا قائم نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں کافی طویل عرصے سے کام جاری تھا۔

پائلٹ پلانٹ کے اندر جب اس ٹیم کو لے جایا گیا تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں ایک سو ساٹھ سینٹری فیوجز رکھے ہوئے ہیں جہاں ابھی مزید بے شمار ایسی مشینیں رکھی جاسکتی تھیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس ٹیم کے افراد کو ایک دوسری عمارت کے اس ہال کو دیکھ کر ہوئی جو بظاہر بالکل خالی پڑا تھا لیکن ایرانی حکام کا کہنا تھا کہ یہاں ایک کمرشل پلانٹ تعمیر کیا جائے گا جہاں پچاس ہزار سینٹری فیوج مشینیں رکھی جاسکیں گی۔ ان

سینٹری فیوج مشینوں کی مدد سے اتنی بڑی مقدار میں یورینیم افزودہ کیا جاسکے گا جو سالانہ بیس سے تیس جوہری ہتھیاروں کے تیار کرنے میں کام آسکے۔ جینونن نے ایرانی حکام سے دریافت کیا کہ انھوں نے ان سینٹری فیوج مشینوں کو کس طرح تیار کرلیا اور اس ترقی کا اصل راز کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''انھوں نے آج سے پانچ برس قبل انٹرنیٹ سے سینٹری فیوج مشین بنانے کا طریقہ سیکھا تھا۔'' جینونن نے جواباً کہا ''یہ ناممکن ہے۔'' سینٹری فیوج جیسی جدید اور حساس مشین تیار کرنا ایران کی تکنیکی صلاحیت کے پیش نظر اسے ناممکن دکھائی دیا۔ ایران اس قابل نہیں تھا کہ سینٹری فیوج پروگرام پر عملدرآمد کرسکے۔ بہرصورت آنے والے مہینوں میں بھی ایرانی حکام بدستور اس بات پر اڑے رہے کہ یہ تمام تر ترقی اور کارنامہ ایرانی سائنس دانوں اور انجینئروں نے خود اپنی اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر انجام دیا ہے۔ یہ ساری تکنیکی پیش رفت خود ایرانیوں کی ہے تاہم کسی نے بھی ایک سیکنڈ کے لیے ان کی اس بات پر قطعاً یقین نہیں کیا۔

جب تین افراد پر مشتمل انسپکٹروں کی اس ٹیم کے برطانوی ماہر ٹریور ایڈورڈز نے بعد میں ان سینٹری فیوج مشینوں کو دیکھا تو دفعتاً اس کے ذہن میں یہ خیال آگیا کہ یہ ڈیزائن ایرانی حکام کو کہاں سے ہاتھ لگے تھے؟ یہ یورینکو کے ان ڈیزائنوں سے انتہائی مشابہ تھے جنھیں ربع صدی پیش تر پاکستانی ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے یورینکو کے زمانۂ ملازمت میں سرقہ کیا تھا اور جس پر P-1 کے کوڈ تحریر تھے۔ ان سینٹری فیوج ڈیزائنوں نے پاکستان کے جوہری پروگرام کی پیش رفت میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ ٹریور ایڈورڈز کو یاد آنے لگا کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں جب اس نے یہ ڈیزائن یورینکو نیدرلینڈ میں دیکھے تھے ان میں اب تک قطعاً کوئی تبدیلی اور فرق دکھائی نہیں دیتا۔ ہر شے اور ہر چیز بالکل ویسی ہی تھی۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان سینٹری فیوج مشینوں کے بعض حصے پہلے ہی استعمال کیے جاچکے تھے جس کے نتیجے میں ایران بہت جلد اعلیٰ قسم کا

افزودہ یورینیم حاصل کر سکتا ہے جس کی مدد سے جوہری ہتھیاروں کی تیاری ممکن ہو گئی ہے۔ یہ تمام شواہد، ثبوت اور اشارے کسی ایک مقام اور ایک شخص کی جانب انگشت نمائی کر رہے تھے جو ایران کی اس زبردست پیش قدمی اور پیش رفت کا اصل ذریعہ تھا۔ پہلے پہل بہت سے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ ایران نے یہ سب کچھ اپنے بل بوتے پر ہی کیا ہے لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ خیال دھندلانے لگا اور اس دھند میں سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا چہرہ ابھرنے لگا جس کے ساتھ ساتھ ان کی پراسرار سرگرمیاں اور ایران سے ان کی دیرینہ محبت اور تائید وحمایت کے تمام تر آثار اور شواہد خود بخود سامنے آ گئے۔

ایران: درآمد سے برآمد تک

جوہری طالع آزمائی کی شاہراہ پر ایران کی لمبی چھلانگ

۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر تک متحدہ عرب امارات کی خلیجی ریاست دبئی کو تجارت اور سیاحت کے ایک اہم اور معروف مرکز کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی تھی تاہم دبئی پاکستانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی تمام تر سرگرمیوں اور کارروائیوں کا ایک بنیادی مرکز بن چکا تھا جہاں سے انھوں نے جوہری ٹیکنالوجی خریدنے کے علاوہ اسے فروخت کرنے کے سلسلے کا بھی آغاز کیا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اواخر ہی سے ڈاکٹر خان نے دبئی کو ایک ایسے شہر کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا جہاں وہ نہ صرف سپلائرز سے ملاقاتیں کیا کرتے تھے بلکہ پاکستان کو حساس نوعیت کا مواد روانہ کرنے کی غرض سے اسے ایک ٹرانزٹ کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ مشرق اور مغرب کے وسط میں واقع ہونے اور بنیادی طور پر ایک خالصتاً کاروباری وتجارتی شہر ہونے کے ناتے وہاں کسی بھی قسم کے شکوک وشبہات اور سوالات کی قطعاً کوئی گنجائش اور جواز موجود نہ تھا۔ یہ مقام ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سرگرمیوں کے لحاظ سے ایک آئیڈیل مقام تھا جہاں سے وہ

اپنے تمام مقاصد پورے کیا کرتے تھے۔ جوہری ٹیکنالوجی اور رازوں کے پھیلاؤ کے حوالے سے وہ اس پُراسرار دنیا کے ایک مشہور اور معروف کردار کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ ان کی شہرت پاکستان کے لیے ایٹم بم بنانے والے سائنس داں کی حیثیت سے ہر سمت پھیلتی جا رہی تھی۔ ان کے پاس مطلوبہ علم، صلاحیت اور معلومات کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت اور ذات کو پوری دنیا کے روبرو ایک ماڈل بنا کر پیش کرنے کا سلیقہ بھی تھا۔ کہوٹہ کی خان ریسرچ لیبارٹری میں وہ ایک مخصوص منفرد، برانڈ نام کے تحت، اپنی برآمدات کو آگے بڑھا رہے تھے۔ چناں چہ دبئی ہی کے ایک دفتر میں ۱۹۸۷ء کے دوران ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک نے اپنا بالکل پہلا سودا طے کیا۔ نیٹ ورک کی ملاقات ایران کے نمائندوں سے ہونے والی تھی جس کی جوہری طالع آزمائی اور آرزوؤں کا سلسلہ ابھی ابھی شروع ہوا تھا اور جو بے حد بے چین اور مضطرب تھا کہ کسی طور پر یہ جدید ترین جوہری ٹیکنالوجی اسے بھی حاصل ہو جائے۔ اس سال یعنی ۱۹۸۷ء کے شروع میں سوئٹزرلینڈ میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران ڈاکٹر خان نیٹ ورک سے تعلق رکھنے والے سوئٹزرلینڈ میں مقیم سپلائرز کے توسط سے یہ طے ہو چکا تھا کہ ایران کو ہر ایک آئٹم کی پرائس لسٹ مہیا کی جائے گی۔ اب ایرانی حکام اپنی شاپنگ لسٹ ہمراہ لے کر آئے تھے۔ ایران سے ہونے والے اس سودے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی نمائندگی کے فرائض ایس ایم فاروق انجام دے رہا تھا جس کا تعلق بھارت سے تھا۔ وہ بے حد چالاک شخص تھا جسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اپنے سے برتر اور کم تر ہر دو قسم کے لوگوں سے کس طرح نمٹنا چاہیے۔ اسے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ذاتی اعتماد حاصل تھا اور وہ ان سے بے حد قریب تھا۔ چوں کہ ایس ایم فاروق کا قیام دبئی میں تھا لہٰذا اس نے تیزی سے وسعت پذیر اس کاروبار کے حوالے سے بے حد اہم اور کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس قسم کے تمام تر سودے شہر میں واقع اس کے تین بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں طے

کیے جاتے تھے جو ایک عمارت کی آٹھویں منزل پر واقع تھا۔ تاہم ایرانیوں سے طے پانے والا یہ سودا اس فلیٹ کے بجائے ایک ہوٹل میں انجام پذیر ہوا تھا۔

ایران سے ہونے والے اس سودے کی ادائیگی سوئس فرانک کے ایک چیک کی صورت میں ہونا طے پائی تھی۔ یہ سودا تین ملین امریکی ڈالرز کے لگ بھگ تھا۔ ایس ایم فاروق ایک ایرانی باشندے کو ہمراہ لے کر پہلے بینک گیا تاکہ ایران کی جانب سے دیا گیا چیک بینک میں جمع ہوسکے۔ اس دوران ایرانی ٹیم کے بقیہ افراد اور ڈاکٹر خان نیٹ ورک کے ارکان ہوٹل کے ایک کمرے میں بڑی بے چینی کے ساتھ ان دونوں افراد کا انتظار کرنے لگے جو ہوٹل کے بالمقابل واقع بینک میں گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر خان نیٹ ورک کے ایک سپلائر کے بریف کیس میں وہ تمام ڈرائنگز اور ڈیزائن موجود تھے جن کی ایرانیوں کو شدومد سے ضرورت تھی۔ بہرکیف دونوں جانب بداعتمادی اور بدحواسی کی کیفیات طاری تھیں۔ بینک میں فاروق نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک مذکورہ چیک کی تصدیق اور توثیق مکمل نہ ہوگئی جس کے بعد فاروق نے بینک سے فون کر کے ہوٹل میں موجود اپنے نیٹ ورک کے لوگوں کو اس بات سے آگاہ کیا کہ سودا مکمل ہو چکا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی ایران نے اپنی جوہری طالع آزمائی کے راستے پر ایک لمبی چھلانگ لگا دی تھی۔

ایران کی جوہری ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی خواہش کوئی نئی خواہش نہیں بلکہ اس کی جڑیں ماضی میں بہت گہرائی تک موجود رہی ہیں۔ اس کا سلسلہ ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب سے بھی پہلے موجود رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے درمیانی حصے میں جب ایران اندرونی طور پر شدید بحران اور افراتفری کا شکار تھا تب جوہری قوت کی اس خواہش نے جنم لیا تھا۔ تیل کی دولت سے مالا مال ایران کے شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی نے اعلانیہ طور پر اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ ایٹمی توانائی کے پروگرام پر عمل درآمد کے شدت سے

خواہشمند ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں ایران نے ایک جرمن کمپنی سے "بوشہر" میں جوہری ری ایکٹر کی تعمیر کا معاہدہ کیا تھا جو خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہے۔ اگرچہ ایران کے ساحلی شہر بوشہر میں تعمیر کیا جانے والا جوہری ری ایکٹر جوہری توانائی کے حصول کی غرض سے تھا تاہم امریکی انٹیلی جنس کے ذرائع کو یہ شبہ تھا کہ شہنشاہ ایران اس ایٹمی ری ایکٹر کے پردے میں جوہری ہتھیاروں کی تیاری کا پروگرام بنا رہے ہیں یا پھر انھوں نے اسے ایک متبادل کے طور پر رکھا ہے تاکہ جب ضرورت پڑے ضروری تحقیق اور ریسرچ کے بعد وہ جوہری ہتھیاروں کی تیاری شروع کر سکیں۔ چوں کہ یورینیم کو افزودہ کرنے کے پلانٹ اور ایٹمی ری ایکٹرز کو بھی جوہری ہتھیاروں کے پروگرام میں یکساں طور پر استعمال کرنا ممکن ہوتا ہے لہٰذا یہ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ آیا یہ توانائی سویلین مقاصد کے لیے استعمال کی جائے گی یا اسے جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں بروئے کار لایا جائے گا؟ بہرصورت شہنشاہ ایران کے لیے اور بعد میں آنے والے ایرانی لیڈروں کے نزدیک بھی جوہری توانائی صرف قومی تحفظ اور سلامتی کی فراہمی ہی کا ایک ذریعہ نہیں رہی ہے بلکہ اس کا تعلق اس عزت، توقیر اور احترام سے بھی ہے جو ایران کی گمشدہ سلطنت کی بحالی کے تصور سے وابستہ ہے جس نے کبھی اس خطے کے ایک بہت بڑے حصے پر حکومت کی تھی۔ چناں چہ جوہری توانائی کا حصول اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایرانی عوام کو دنیا میں ان کا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل ہوسکے۔

بہرنوع شہنشاہ ایران کے حقیقی عزائم سے قطع نظر ان کے اس فیصلے نے عراق کے صدر صدام حسین کو بھی بالآخر اس نہج پر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہمسایہ ملک ایران کے ساتھ فوجی قوت اور عسکری طاقت کے توازن کو قائم رکھنے کی غرض سے عراق کو بھی جوہری پروگرام شروع کرنا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے حکام کو اس سمت میں پیش قدمی کا حکم دے دیا جس کے نتیجے میں جوہری توانائی کے حصول کی دوڑ کا آغاز ہوگیا۔ ایران

کے جوہری قوت بننے کے اعلان نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا جس سے متاثر ہو کر صدام حسین نے فرانس سے ایٹمی ری ایکٹر خریدنے کا سودا کر لیا، ایران اور عراق کو ہمیشہ اس حقیقت کا بڑی شدت سے احساس رہا ہے کہ وہ ایک خطرناک ہمسائے کے ساتھ رہتے ہیں۔ چناں چہ دونوں ایک دوسرے کے عزائم سے ہمیشہ تشویش میں مبتلا رہے ہیں۔ ان دونوں کو ہمیشہ یہ خوف لاحق رہا ہے کہ کہیں ان کا ہمسایہ ملک انھیں پیچھے نہ چھوڑ دے لہٰذا ایسے شکوک وشبہات اور ڈر خوف کے ماحول میں کسی جوہری پروگرام کی بھنک بھی کس قدر پریشان کن اور تشویش ناک ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ایران اور عراق کے باہمی تعلقات کے پس منظر میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ بہرطور ان دونوں ممالک میں سے ہر ایک نے کبھی اعلانیہ یہ اعتراف نہیں کیا کہ وہ جوہری ہتھیار تیار کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کا دعویٰ محض یہ تھا کہ وہ جوہری توانائی خالصتاً توانائی اور بجلی کی پیداوار کے مقصد سے حاصل کرنے کے لیے خواہش مند ہیں۔ حالاں کہ دونوں اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ جوہری ٹیکنالوجی کو دونوں مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بہرنوع ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب کے نتیجے میں شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کا تخت الٹ گیا اور ایران کا ممکنہ جوہری پروگرام معرض خطر میں پڑ گیا کیونکہ ایران کے نئے برسر اقتدار آنے والے روحانی رہنما آیت اللہ خمینی نے مغرب کے ساتھ کیے جانے والے تمام معاہدے منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا تھا جن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں کیا گیا معاہدہ بھی شامل تھا۔ آیت اللہ خمینی کے نزدیک جوہری ہتھیار کی تیاری شیطانی کام تھا اور اسی سبب سے جوہری پروگرام پر عمل درآمد کرنا ایک غیر اسلامی فعل قرار پایا۔ شہنشاہ ایران کے دورِ اقتدار میں شروع کیا گیا جوہری ٹیکنالوجی کے حصول کا پروگرام اب زنگ آلود ہوتا جا رہا تھا، ملک میں موجود تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ مہارت

کے حامل ڈاکٹرز اور سائنس دان اس سیاسی ماحول کو دیکھ کر مغربی ممالک کا رُخ کرنے لگے۔ ۱۹۷۹ء کے ایرانی مذہبی انقلاب سے قبل چار ہزار پانچ سو ایرانی باشندے ایران کی اٹامک انرجی آرگنائزیشن کے لیے کام کر رہے تھے جن کی مجموعی تعداد اب گھٹ کر فقط آٹھ سو رہ گئی تھی۔

ایران پر عراق کا حملہ

عراق نے ایرانی حکومت کی اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایران پر فوجی حملہ کر دیا جو تقریباً ایک عشرے تک جاری رہا۔ اگرچہ ۱۹۸۱ء میں اسرائیل نے عراق کا ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیا تھا اس کے باوجود عراق کی جارحیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ عراق نے ایران کے خلاف اس جنگ کے دوران وہ کیمیائی ہتھیار بھی استعمال کیے جو مغرب کی جانب سے دیے گئے ساز و سامان کی مدد سے تیار کیے گئے تھے۔ اس طویل جنگ کے دوران عراقی افواج نے مجموعی طور پر ایسے ایک لاکھ بم، راکٹ اور شیل استعمال کیے جو کیمیائی نوعیت کے تھے۔ اس صورتحال میں ایران کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فوری طور پر جوہری ٹیکنالوجی کی صلاحیت حاصل کر لے۔ چناں چہ ۱۹۸۴ء کے بعد ایران میں ایٹمی ریسرچ پروگرام کا آغاز پارلیمنٹ کے اسپیکر اور بعدازاں ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی کی نگرانی میں دوبارہ ہو گیا۔ ہاشمی رفسنجانی ایران کو بہر قیمت ایک جوہری طاقت بنانے کے خواہش مند تھے۔ چناں چہ بیرون ملک نقل مکانی کر جانے والے ایرانی سائنس دانوں اور طلباء کو واپس بلانے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ ایران کے جوہری پروگرام کی تکمیل میں مدد دے سکیں۔ تاہم یہ کوشش کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی۔ داخلی سطح پر کوئی کامیابی نہ ہونے کی صورت میں ایرانی حکومت نے بیرون ملک سے مدد حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ ۱۹۸۹ء میں ہاشمی رفسنجانی جب ایران کے صدارتی منصب پر فائز ہو گئے تو انھوں نے کوشش شروع کر دی کہ ان

ممالک سے جوہری ٹیکنالوجی کے حصول کی طرح ڈالی جائے جو غیر قانونی اور ناجائز طور پر اس ٹیکنالوجی کی فروخت اور تجارت میں ملوث ہیں۔ ان ممالک میں پاکستان، عوامی جمہوریہ چین، شمالی کوریا، لیبیا اور دیگر ممالک شامل تھے جو جوہری ٹیکنالوجی کی غیر قانونی خرید و فروخت اور تجارت میں ملوث تھے۔ چناں چہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں شمالی کوریا سے پانچ سو ملین ڈالر کا ایک معاہدہ طے پا گیا جس کے تحت شمالی کوریا نے ایران کو جوہری میزائل کے علاوہ دیگر ساز و سامان اور یورینیم کی پیداوار میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جنوری ۱۹۹۳ء میں صدر ہاشمی رفسنجانی شمالی کوریا کے دورے پر گئے تاکہ ایٹمی میزائلوں کے سلسلے میں مزید مدد حاصل کر سکیں۔ بہرکیف! دو اہم ممالک جنھوں نے ایران کو جوہری شعبے میں خصوصی تعاون فراہم کیا ان میں عوامی جمہوریہ چین اور روس کے نام سرفہرست ہیں۔ چوں کہ مغربی سفارت کاروں کی نظریں ہمیشہ چین اور روس پر ہی مرکوز رہی ہیں لہٰذا بیرون ملک سے ان فراہم کنندگان کے نام پس پردہ چلے گئے جو ایران کو جوہری معلومات فراہم کرنے کے حوالے سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے امریکی انتظامیہ نے ۱۹۹۰ء کے عشرے میں روس اور چین کی حکومتوں پر زبردست دباؤ ڈالا اور اپنا تمام تر سفارتی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے ان دونوں ممالک کی حکومتوں کو روکنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایران کو میزائل اور ایٹمی ٹیکنالوجی کی فراہمی کا سلسلہ بند کر دیں۔ چین اور روس سے اس وقت تک ملنے والی امداد ایران کے لیے خاصی سودمند ثابت ہوئی تھی لیکن اس معاملے میں ایران کا ایک اور خفیہ شراکت دار بھی موجود تھا۔ ایران میں بھی پاکستان ہی کی طرح یہ خیال عام تھا کہ پلوٹونیم کی مدد سے ایٹم بم کی تیاری کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں ہوگا اور یوں دنیا بھر کی نظروں میں آنے کا پورا امکان موجود رہے گا جس کے نتیجے میں ایرانی حکومت کو غیر ملکی سفارتی دباؤ بھی قبول کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس یورینیم کی افزودگی کے ذریعے ایٹم بم کی تیاری کو

دنیا بھر کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا زیادہ بہتر ہوگا۔ پاکستان میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان اسی طریقے پر عمل پیرا تھے جو بالآخر ایران تک بھی پہنچ گیا۔ جس کے نتیجے میں ایران ایٹم بم بنانے کے قریب آ گیا، ان معنوں میں ایران کا راستہ پاکستان کے راستے سے مختلف نہیں ہے۔ چوں کہ یورینیم کی افزودگی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا اور ایران کی داخلی صورت حال بھی اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ اس سلسلے میں کیا جانے والا تحقیقاتی کام اپنی گہرائی اور طوالت کے اعتبار سے خاصا وقت طلب بھی تھا لہٰذا ایرانی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس سے بہتر اور کوئی طریقہ کار نہیں کہ یہ ٹیکنالوجی کہیں اور سے خرید لی جائے۔ پاکستان کے ایٹم بم تیار کرنے کی داستان اب عام ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بھی دنیا کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پاکستان کے لیے یہ کام کر رہے ہیں چناں چہ تلاش اور تفتیش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر جنرل ضیاء الحق کے علم اور نگرانی میں پاکستان اور ایران کی حکومتوں کے مابین پہلا رابطہ قائم ہوا اور سرکاری سطح پر جوہری شعبے میں دونوں ملکوں کے درمیان تعاون کا آغاز ہو گیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ایران سے رابطہ

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا پہلا رابطہ ایرانی حکومت سے کب ہوا یہ اب تک واضح نہیں ہے۔ بھارت کے انٹیلی جنس ذرائع کا ماننا ہے کہ اعلیٰ سطح کے ایک ایرانی سائنس دان نے ۱۹۸۴ء میں پاکستان کا دورہ کیا تھا جس کے بعد ڈاکٹر خان کا ایرانی حکومت سے پہلا رابطہ قائم ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر خان نے ۱۹۸۶ء میں ایران کا خفیہ دورہ کیا تھا تاکہ ایرانی شہر ''بوشہر'' میں اس ری ایکٹر کا معائنہ کر سکیں جسے عراقی طیاروں نے بم باری کر کے نقصان پہنچایا تھا۔ بعض اطلاعات کے مطابق جنوری ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک نجی جیٹ طیارے میں اسلام آباد سے تہران تک سفر کیا تھا تاکہ اعلیٰ سطح کے ایرانی حکام سے ملاقات کے دوران یورینیم کی افزودگی کے قابل عمل طریقے پر اپنے

خیالات ان تک پہنچا سکیں۔ ۱۹۸۷ء کے دوران ہونے والے سرکاری معاہدے نے ڈاکٹر خان کے ساتھ ایرانی روابط کو ایک جائز قانونی صورت عطا کردی تھی اور انھیں درپردہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کا عندیہ بھی مل چکا تھا، لہٰذا اب سوال یہ تھا کہ پاکستان اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایران کو مزید کیا دے سکتے ہیں؟ ۱۹۸۷ء کے دوران خلیجی ریاست دبئی میں ڈاکٹر خان نیٹ ورک اور ایران کے مابین ہونے والے تین ملین امریکی ڈالر کے سودے کی تفصیلات آپ کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ تاہم بعض دیگر واقعات اس مسودے کے حوالے سے قارئین کے لیے مزید دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ۱۹۸۷ء کے دوران دبئی میں کیے گئے سودے کی تمام تر تفصیلات ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی عدم موجودگی میں ان کے قابل اعتماد ساتھی ایس ایم فاروق کے ذریعے طے کی گئی تھیں۔ خود ڈاکٹر خان اس موقع پر موجود نہ تھے۔ اس مسودے میں ایس ایم فاروق کے علاوہ ان کے جواں سال بھتیجے بی ایس طاہر نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے ایس ایم فاروق کا اصل تعلق بھارت سے تھا جہاں سے وہ پہلے سری لنکا اور بعدازاں ۱۹۸۰ء کے دوران دبئی منتقل ہوگئے تھے جہاں فاروق کے بھائی اور طاہر کے والد نے امپورٹ کا بڑا کامیاب کاروبار قائم کررکھا تھا لیکن ۱۹۸۵ء میں فاروق کے بھائی وفات پاگئے لہٰذا یہ کاروبار فاروق نے سنبھال لیا اور رفتہ رفتہ اس پورے کاروبار پر زبردستی قابض ہوگیا۔ بعد میں اس نے اپنے حقیقی بھتیجے طاہر کو بھی اس تجارت سے بے دخل کردیا تاکہ تن تنہا اس پر قبضہ جما سکے۔ بعد میں طاہر نے بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک میں ایک کلیدی اہمیت حاصل کرلی تھی تاہم ۱۹۸۷ء میں ایران سے ہونے والے سودے میں اس نے خاموش کردار ادا کیا تھا۔ ایرانی وفد سے طے پانے والے اس سودے میں ایرانی نائب صدر کے اسٹاف ممبر نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ بہرکیف! اس سودے کے عوض ملنے والی تین ملین ڈالر کی رقم کا چیک دبئی بینک سے کیش

ہوجانے کے بعد فاروق نے یہ رقم نیٹ ورک کے لوگوں میں تقسیم کردی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اس سودے میں کوئی نمایاں شرکت دار نہ تھے بلکہ ان کے اردگرد موجود نیٹ ورک نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا تھا، چناں چہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے حصے میں تین ملین ڈالر کی ایک چوتھائی رقم ہی آسکی جبکہ اس نیٹ ورک کے یورپین ممبروں نے رقم کا زیادہ تر حصہ وصول کیا۔ بہرصورت! ایران کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے نیٹ ورک کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ ان کی مدد اور تعاون سے ہی ایران یورینیم افزودہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرنے کے قابل ہوسکا اور اس راہ پر کافی آگے بڑھ گیا چناں چہ مغرب کے انٹیلی جنس ذرائع آج بھی اس شک اور شبے میں مبتلا ہیں کہ ڈاکٹر خان کی مدد کے ذریعے ایرانی مسلح افواج درپردہ جوہری پروگرام پر عمل درآمد میں مصروف ہیں اس امکان کو بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی نے بھی مسترد نہیں کیا۔ اب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کلیدی نوعیت کا جوہری مواد بیرون ملک سے درآمد کرنے کے علاوہ جوہری رازوں اور ٹیکنالوجی کے فروخت کنندہ بھی بن چکے تھے اور انھوں نے اپنا ایک بے مثال تجارتی نیٹ ورک قائم کرلیا تھا۔ اب اس مرحلے پر فطری اور قدرتی طور پر یہ سوال ذہن میں ابھرتا اور گونجتا ہے کہ حکومت پاکستان کو ڈاکٹر خان کی ان تجارتی سرگرمیوں کے بارے میں کتنا کچھ معلوم تھا۔ اگر معلوم تھا تو کیا ان کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی تھی کہ اس سے آگے وہ نہیں جاسکتے؟ کیا یہ ڈاکٹر خان کا اپنا ذاتی اور نجی فیصلہ تھا کہ پاکستان کی جوہری معلومات کو تجارتی پیمانے پر استعمال کیا جائے اور اس کے ذریعے دولت حاصل کی جائے یا پھر حکومت پاکستان بھی ان کے اس فیصلے میں برابر کی شریک تھی؟ بہرصورت ایران سے سینٹری فیوج ڈیزائن اور یورینیم کو افزودہ کرنے کے سلسلے میں ہونے والے سودے سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ پاکستان کی حکومت بھی اس معاملے میں برابر کی شریک تھی اور ڈاکٹر خان تو محض اس کی نمائندگی کررہے تھے، تاہم حقائق ممکن

ہے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوں۔ ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایران کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خاصے کشیدہ بھی رہے ہیں جن میں مختلف مواقع پر اتار چڑھاؤ بھی آتے رہے ہیں۔ ان دونوں ممالک کے مابین مفادات کی بنیادی یکسانیت بھی موجود نہیں ہے اور عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ پاکستان کی سرحد پر واقع ملک ایران سے غیر دوستانہ اور مخاصمانہ تعلقات پاکستان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں لہٰذا ایران سے جتنے قریبی تعلقات ہوں گے پاکستان کے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا؟ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی پاکستان اپنی سرحدوں پر واقع ایک ہمسایہ ملک کو جوہری طاقت سے لیس دیکھنا پسند کرے گا؟ ہوسکتا ہے کہ بعض افراد ایسا نہ چاہتے ہوں لیکن جہاں تک حکومت کا تعلق ہے تو ہمارا خیال ہے کہ مستقبل کے پیش نظر حکومت پاکستان کو اس بات پر قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ایران بھی جوہری طاقت حاصل کرلے۔

۱۹۸۰ء کے عشرے کے وسط سے لے کر آخری سالوں تک پاکستان اور ایران ایک دوسرے کے خاصے قریب آچکے تھے اور دونوں ممالک کے مابین جوہری ٹیکنالوجی کے حوالے سے معاملات بھی طے ہوگئے تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ جو ۱۹۸۷ء میں وائس چیف آف آرمی اسٹاف کے عہدے پر فائز ہوئے تھے ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۱ء پاکستان کے آرمی چیف بھی رہ چکے ہیں۔ اپنے نظریات کے اعتبار سے مرزا اسلم بیگ اسلام کے کٹر حامی اور مغرب کے سخت ترین مخالفین میں سے تھے۔ وائس چیف آف آرمی اسٹاف بننے کے بعد بالکل پہلی مرتبہ انھیں پاکستان کے جوہری پروگرام میں عمل دخل کا موقع ملا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے نسبتاً زیادہ آزادانہ جوہری پالیسی کی تشکیل پر زور دیتے ہوئے امریکا اور مغرب سے فاصلہ رکھنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے اس کی غیر معمولی تائید وحمایت کی۔ اپنی تحریروں کے مطابق جنرل بیگ عالمی جوہری عدم پھیلاؤ کے نظام کو جمہوری شکل دے کر ایک کثیر الاطرافی دنیا کی جانب پیش قدمی کے حق میں تھے

جو ان کے خیال کے مطابق سرد جنگ کے زمانے کی دو بڑی ایٹمی قوتوں یا پھر امریکا کی واحد سپر پاور ہونے کی حیثیت کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ محفوظ تصور کی جاسکتی تھی، چناں چہ جوہری ہتھیاروں اور اسلحے کا پھیلاؤ دنیا بھر میں طاقت کے پھیلانے کا ایک مثبت اقدام ثابت ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہی کی طرح جنرل اسلم بیگ بھی اسی خیال کے حامی تھے کہ جوہری پھیلاؤ کا نظام بنیادی طور پر ایک امتیازی نوعیت کا نظام ہے اور تعصب پر مبنی ہے جس کی رو سے مغربی ممالک اور قوتوں کو تو اس بات کی کھلم کھلا اجازت ہے کہ وہ جوہری ہتھیار تیار کریں۔ اسرائیل کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایٹم بم کے حصول کی کوشش کرتا رہے لیکن اسلامی ممالک کو یہ حق اور اجازت حاصل نہیں کہ وہ بھی جوہری ٹیکنالوجی سے استفادہ کرسکیں۔ اگر کسی فرد یا قوم کو مکمل طور پر معدوم یا نیست و نابود ہوجانے کا خطرہ درپیش ہو تو اسے اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی حفاظت، تحفظ اور بقا کا مناسب ترین بندوبست کرسکے۔ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے آکسیجن انتہائی ناگزیر ہے اور اس کی ضرورت اور اہمیت پر کسی بھی قسم کی بحث اور مباحثہ ممکن نہیں۔ اسی طرح جوہری طاقت اور اہلیت کا توازن بھی پاکستان کے لیے اس کی بقا کا ضامن ہے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ کے خیال میں جوہری ہتھیاروں کی ضرورت جنگ میں فتح حاصل کرنے کی غرض سے نہیں پڑتی بلکہ ان کا اصل مقصد طاقت کے توازن کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق جوہری اسلحہ اور ہتھیار تحفظ اور بقا کے ضامن ہوتے ہیں لہٰذا اگر دنیا کے سبھی ممالک اس قوت اور صلاحیت کو حاصل کرلیں گے تو پھر اس صورت میں جنگ کے امکانات بھی کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جنرل اسلم بیگ اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے باہمی تعلقات قریبی اور دوستانہ تھے اور ان کے سیاسی نظریات وخیالات میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی۔

تھے، رابرٹ اوکلے کا تقرر امریکی سفیر کی حیثیت سے اسی زمانے میں اسلام آباد میں ہوگیا۔ رابرٹ اوکلے ایک زیرک، ہوشیار اور طویل تجربے کا حامل سفارتکار تھا۔ شروع شروع میں اوکلے کے تعلقات جنرل مرزا اسلم بیگ کے ساتھ بہت خوشگوار اور اچھے رہے لیکن ۱۹۹۰ء کی دہائی میں پاکستان اور امریکا کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ خراب ہوتے چلے گئے کیونکہ دونوں ممالک کے مابین باہمی اعتماد کا فقدان ہوچلا تھا چنانچہ پاکستان اور امریکا کے کشیدہ تعلقات کا اثر رابرٹ اوکلے اور جنرل بیگ کے باہمی تعلقات پر بھی مرتب ہوا اور ان دونوں کے تعلقات بھی خاصے کشیدہ ہوگئے۔ افغانستان کے خلاف دونوں ممالک کی مشترکہ مہم ختم ہوچکی تھی جس کے بعد اکتوبر کے مہینے میں امریکی حکومت نے پاکستان کے جوہری پروگرام پر پابندی عائد کردی جس کے نتیجے میں دونوں ممالک کے درمیان رہا سہا اعتماد بھی ختم ہوگیا اور اسلام آباد کے حکومتی حلقوں میں یہ احساس تیزی کے ساتھ عام ہونے لگا کہ اب افغانستان کا تمام تر ملبہ تن تنہا پاکستان کو ہی اٹھانا پڑے گا۔ دونوں ممالک کے درمیان تعطل اور جمود کی اس کیفیت نے پاکستانی مسلح افواج کے سخت گیر نظریات رکھنے والے عناصر کو یہ تک کہنے پر مجبور کردیا کہ اب امریکا پاکستان کے لیے قابل اعتبار نہیں رہا۔ اگست ۱۹۹۰ء میں صدام حسین کی کویت پر فوج کشی کے بعد کشیدگی میں مزید اضافہ ہوگیا کیونکہ امریکی حکومت کویت سے عراق کے انخلاء کی غرض سے پاکستانی تائید وحمایت حاصل کرنے میں یکسر ناکام رہی تھی۔ بہرصورت ۱۹۹۰ء میں عراق کی جانب سے کویت پر جارحانہ حملے نے پاکستان کے لیے بڑی عجیب وغریب مگر دلچسپ صورتحال پیدا کردی تھی۔ پاکستان کے نئے وزیراعظم نواز شریف کے سعودی حکومت سے نہایت قریبی دوستانہ تعلقات تھے چنانچہ نومبر ۱۹۹۰ء میں نواز شریف سعودی عرب پہنچ گئے اور شاہ فہد کو پانچ ہزار پاکستانی فوجی دستوں کی پیش کش کی تاکہ عراق اور سعودی عرب پر کسی ممکنہ حملے کے نتیجے میں سعودی سلطنت کا دفاع

کیا جاسکے، تاہم مسلح افواج کے کمانڈر جنرل مرزا اسلم بیگ نے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ خلیجی جنگ درپردہ اور خفیہ طور پر مسلم دنیا کی تیل کی دولت پر قبضہ کرنے کا ایک منصوبہ ہے، چنانچہ مسلم ممالک کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی غرض سے امریکا کی خواہش ہے کہ اسرائیل کے لیے راہ ہموار کرتے ہوئے عراق کی ملٹری مشین کو مکمل طور پر تباہ کردیا جائے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے عوامی جمہوریہ چین کی پشت پناہی میں ایران اور پاکستان کے مابین فوجی اور عسکری تعاون اور اشتراک ضروری ہے تاکہ ان دنوں ممالک کے جوہری پروگرام کو بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جاسکے۔ ایک موقع پر جب جنرل مرزا اسلم بیگ تہران کے دورے سے واپس آئے تھے امریکی سفیر رابرٹ اوکلے ان سے ملنے پہنچ گئے۔ جنرل بیگ کا خیال تھا کہ وہ ایرانیوں اور بالخصوص انقلابی گارڈز کے ساتھ مل جل کر کام کرسکتے ہیں۔ وہ انقلابی گارڈز کے لیڈر سے بھی تہران میں ملاقات کرچکے تھے۔ امریکی سفیر رابرٹ اوکلے اس ملاقات کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہتے ہیں جنرل بیگ کے اپنے مخصوص خیالات اور نظریات تھے جن کا میرے خیال میں ایرانیوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے جوہری پروگرام کی جانب پیش قدمی کررہے تھے اور انھوں نے جنرل بیگ کو شیشے میں اتارنے کی غرض سے پیشکش کی کہ دونوں ممالک اس شعبے میں مل جل کر بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ جنرل بیگ کو پورا یقین تھا کہ امریکا انتہائی سنگین اور خطرناک صورتحال میں گھر جائے گا اگر اس نے عراقی افواج کو کویت سے نکال باہر کرنے کا فیصلہ کیا۔ رابرٹ اوکلے نے مزید کہا کہ امریکا کی جانب سے عراقی افواج کو کویت سے بے دخل کرنے کی صورت میں امریکا کے لیے سخت بحرانی صورت حال پیدا ہوجائے گی۔ مصر اور سعودی عرب جو امریکا کے حلیف اور اتحادی ممالک ہیں، کویت سے عراقی فوجوں کی بے دخلی کے نتیجے میں اپنی ساکھ اور اعتبار سے محروم ہوجائیں گے۔ ایسی

صورت میں پاکستان اور ایران دونوں مل کر مسلم دنیا میں آگے بڑھ کر سبقت اور برتری حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ محض ایک دل خوش کن تصور تھا تاہم جنرل مرزا اسلم بیگ کے سوچنے کا انداز یہی تھا۔

ایرانی حکومت نے تنازع کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کو تائید و حمایت کی پیشکش کرنے کے علاوہ تیل کی فراہمی کو بھی یقینی بنانے کا وعدہ کیا لیکن اس کے عوض اسے کچھ درکار تھا اور وہ تھا ایٹم بم!!! رابرٹ اوکلے سے ہونے والی ملاقات کے دوران جنرل بیگ نے کھل کر اس بات کا اظہار کیا کہ ایران کے جوہری شعبے میں فراہم کی جانے والی اعانت کے بدلے پاکستان کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ رابرٹ اوکلے نے جنرل بیگ سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کو ارسال کر دی جس پر امریکی حکومت نے پاکستان سے احتجاج کیا۔ جنرل بیگ عام طور پر دیگر امریکی افسران سے ملاقات کے دوران بھی اسی قسم کے تاثرات اور خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے تاہم پاکستان کی سیویلین لیڈر شپ نے امریکی حکومت کو یقین دہانی کرا دی کہ ایران سے جوہری شعبے میں اعانت کی فراہمی کا کوئی معاہدہ موجود نہیں ہے اور جنرل اسلم بیگ نے جن خیالات کا اظہار کیا انھیں حکومت نے منظور نہیں کیا۔

بے نظیر بھٹو کے خیالات

بے نظیر بھٹو نے کہا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں جب انھوں نے اقتدار سنبھالا تھا تو جوہری ٹیکنالوجی کی برآمد کا مسئلہ ایجنڈے پر موجود تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ۱۹۸۹ء کے اواخر میں انھوں نے سینئر افسران کو طلب کر کے جوہری ٹیکنالوجی کی برآمد پر ہر قسم کی پابندی عائد کر دی تھی۔ بہرنوع دیگر اطلاعات کے مطابق ۱۹۸۹ء میں ایران کے صدر ہاشمی رفسنجانی نے تہران میں ایک استقبالیے کے دوران پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے اس موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے انھیں یہ بتایا تھا کہ ان کے جنرلوں نے غالباً

فوجی بنیادوں پر ایران کو جوہری ٹیکنالوجی کے تبادلے کی پیش کش کی ہے جس کے لیے ابھی پاکستانی وزیر اعظم کی منظوری چاہیے۔ بے نظیر بھٹو کا کہنا ہے کہ انھوں نے اس پیش کش کو فوری طور پر مسترد کرتے ہوئے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ بے نظیر بھٹو کا یہ بھی کہنا ہے کہ ۱۹۹۳ء میں جب وہ دوسری مرتبہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوئیں تو اس موضوع پر مزید گفتگو ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ایرانی حکومت کو ایک پیش کش کی گئی ہے اور انھیں مزید اعانت کی فراہمی بھی زیر غور ہے۔ بے نظیر بھٹو کا کہنا ہے کہ پاکستانی فوجی جنرلوں کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ ایران کو جوہری ٹیکنالوجی فروخت کر کے وہ بے شمار دولت حاصل کر سکتے ہیں تاہم میں نے اس سلسلے میں ہمیشہ ان فوجی جنرلوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے انھیں یہی بتایا کہ اگر انھوں نے پاکستان کی جوہری ٹیکنالوجی کو فروخت کرنے کی کوشش شروع کر دی تو دنیا کے صرف تین ہی ممالک ایسے ہیں جو اسے خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہوں گے چنانچہ یہ کوئی میکڈونلڈ کے برگر نہیں کہ پوری دنیا انھیں کھانے کے لیے دوڑ پڑے۔

نواز شریف

جب نواز شریف پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تو پاکستانی فوجی جنرلوں نے ایسی ہی تجاویز انھیں بھی پیش کرنا شروع کر دیں۔ سابق پاکستانی سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ جنرل اسلم بیگ اور آئی ایس آئی کے سربراہ درانی نے صدر پاکستان غلام اسحٰق خان سے رابطہ کر کے جوہری ٹیکنالوجی کی فروخت کا مجوزہ منصوبہ ان کے روبرو پیش کیا تاکہ افغانستان اور کشمیر میں آئی ایس آئی کے آپریشنز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے رقومات کا بندوبست کیا جا سکے۔ واضح رہے کہ امریکی حکومت اس زمانے میں افغانستان میں جاری آپریشن کے لیے کسی قسم کی مالی امداد نہیں دے رہی تھی۔ دوسری جانب کشمیر میں بھی آئی ایس آئی جہادی سرگرمیوں کے آغاز کا پروگرام بنا رہی تھی اور اس

مقصد کے لیے اسے غیر معمولی رقومات کی ضرورت تھی۔ اس تجویز میں مضمر مہلک سیاسی خطرات کو دیکھتے ہوئے غلام اسحٰق خان نے یہ تجاویز وزیر اعظم پاکستان نواز شریف کو بھجوادیں جنھوں نے ان تجاویز کو یکسر مسترد کر دیا۔ بعدازاں نواز شریف کی کابینہ میں شامل ان کے وزیر خزانہ نے یہ انکشاف کیا کہ پاکستانی مسلح افواج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے نواز شریف کو بتایا کہ ایک برادر ہمسایہ ملک یعنی ایران جوہری ٹیکنالوجی کے عوض بارہ بلین ڈالر (دیگر اطلاعات کے مطابق آٹھ بلین ڈالر) ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ سابق وزیر خزانہ کا کہنا ہے کہ جنرل بیگ کے علاوہ دیگر فوجی جنرلوں نے بھی نواز شریف پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس تجویز کو منظور کر لیں۔ دسمبر ۱۹۹۴ء میں ایک پاکستانی اخبار نے یہ خبر شائع کی کہ آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل درانی کو ۱۹۹۲ء کے دوران جوہری ٹیکنالوجی کی منتقلی کے عوض تین اعشاریہ دو بلین ڈالر کی پیشکش موصول ہوئی تھی۔ خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جنرل مرزا اسلم بیگ کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ سینٹری فیوج اور دیگر تشکیلی پرزے اور ساز و سامان ایران کو منتقل کر دینے چاہئیں لہٰذا اس کی منظوری حکومت سے لینا ضروری ہے۔ اطلاعات کے مطابق جنرل بیگ کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ان سرگرمیوں کی بابت پورا علم تھا۔ بہرکیف ڈاکٹر خان کا کہنا تھا کہ ہم جو ٹیکنالوجی ایران کو منتقل کریں گے اس کے ذریعے یورینیم کی افزودگی حقیقی معنوں میں ممکن نہیں ہو سکے گی۔ تاہم جنرل اسلم بیگ ان تمام واقعات کی تردید کرتے ہیں۔ اس صورت حال کے بارے میں انھوں نے بعد میں وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہم سب نے مل کر ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت سے لے کر جنرل مشرف کی فوجی حکومت تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور انھیں تحفظ مہیا کیا۔ وہ یورینیم کو افزودہ کرنے کی غرض سے آلات، پرزے، اوزار، مواد اور دیگر ساز و سامان باہر سے درآمد کرنے کے خواہش مند تھے۔ ہم نے ان

کوششوں میں ان کی بھرپور مدد کی تاکہ وہ اپنے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اپنی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے جنرل بیگ نے بتایا "مجھے شبہ ہے کہ ایرانیوں کے علاوہ شمالی کوریا اور لیبیا کو بھی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ پاکستان ان تمام آئٹمز کو چرانے، خریدنے یا ان کی اسمگلنگ میں ملوث ہے جنھیں جوہری صلاحیت اور اہلیت کے حصول کی غرض سے استعمال کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہ بات جان کر انھوں نے پاکستانی سائنس دانوں سے رابطہ قائم کیا ہو اور ان سے دریافت کیا ہو کہ یہ اجزاء کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں؟ پاکستانی سائنسدانوں نے انھیں بتا دیا ہوگا کہ فلاں فلاں کمپنی سے وہ یہ پرزہ جات اور ساز و سامان خرید سکتے ہیں تو ایسا کرنا کوئی جرم ہے؟ صرف اتنی معمولی سی بات پر تو آپ ان سائنس دانوں کو سزا کا مستوجب قرار نہیں دے سکتے۔

شمالی کوریا: پیانگ یانگ سے واپسی

جب پاکستانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اپنے طیارے سے باہر آئیں تو شمالی کوریا کے عوام کا رنگارنگ مجمع ان کے خیر مقدم کی غرض سے ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۹۳ء کا ذکر ہے جب سردی کی شدت بھی بڑھ چلی تھی لیکن شمالی کوریا میں ان کا جو استقبال ہوا وہ واقعی گرم جوشی کا مظہر تھا۔ بے نظیر بھٹو دوسری بار برسر اقتدار آئی تھیں۔ جب ان کا یہ جلوس پیانگ یانگ کی شاہراہوں سے گزرا تو دونوں جانب عوام قطار میں کھڑے ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے۔ اس رات شمالی کوریا کے لیڈر کم ال سنگ نے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ آپ کے مرحوم والد نے آج سے سترہ برس قبل دوستی کی جس شاہراہ کا افتتاح کیا تھا آپ بھی اسی پر گامزن ہیں۔ واضح رہے کہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے پاکستان اور شمالی کوریا کے مابین مکمل سفارتی تعلقات قائم کیے تھے۔ کم ال سنگ نے اپنی تقریر میں ذوالفقار علی بھٹو کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ایشیائی عوام نے تکنیکی اعتبار سے جو صلاحیت

اور مہارت بم پہنچائی ہے، وہ براعظم ایشیا میں بسنے والے لوگوں کی آزادی، خودمختاری اور خوشحالی کی ایک مضبوط اور توانا ضمانت ہے جس کی بنیاد باہمی تعاون پر قائم ہے۔ کم ال سنگ کی اس تقریر کے جواب میں بینظیر بھٹو نے کہا کہ ایشیائی ممالک کو چاہیے کہ ایک دوسرے سے تعاون کریں تاکہ ان کی ممکنہ صلاحیتیں اور اہلیت بروئے کار لائی جاسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پاکستان بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ جوہری عدم پھیلاؤ کو ایک حیلہ اور بہانہ بنا کر اس بات کا جواز مہیا نہ کیا جائے کہ دنیا کی دیگر ریاستوں اور ممالک کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خالصتاً اور کلی طور پر پرامن مقاصد کے لیے جوہری ٹیکنالوجی حاصل کرسکیں۔ بظاہر بے نظیر بھٹو کا دورہ ایک سفارتی روایت کی تکمیل تھی لیکن اس کے پس پشت کچھ اور محرکات کام کر رہے تھے۔ چناں چہ اپنے مختصر سے قیام کے دوران انھوں نے پاکستان کے لیے شمالی کوریا کی حکومت سے ایک اہم معاہدہ کیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگیں تو ان کا طیارہ نہایت بیش قیمت کارگو سے لدا ہوا تھا جو یا تو اس "نوڈونگ میزائل" کے علیحدہ کیے گئے حصوں پر مشتمل تھے جسے شمالی کوریا نے تیار کیا تھا یا پھر یہ سازوسامان کمپیوٹر ڈسک سے اتارے گئے ان میزائل بلیو پرنٹس کا تھا جنھیں مختلف حصوں میں تقسیم کرکے رکھا گیا تھا۔ درحقیقت اسی واقعے سے شمالی کوریا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے مابین باہمی رابطے کے دروازے کھلتے ہیں اور یہیں سے ان دونوں کے مابین تعلقات کار کا آغاز ہوتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ شمالی کوریا کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جو انتہائی خفیہ اور پوشیدہ نوعیت کے منصوبوں پر عملدرآمد کرتے رہتے ہیں چناں چہ اس کے جوہری پروگرام اور ڈاکٹر خان سے روابط پر بھی پراسراریت اور اندازوں کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں جن کے بارے میں محض قیاس آرائیاں ہی ممکن ہیں۔ بہرطور حقیقت تو یہی ہے کہ بے نظیر بھٹو کے شمالی کوریا کے اس دورے کو ممکن بنانے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ہی راستہ ہموار کیا تھا جو پاکستان اور

شمالی کوریا کے مابین جوہری محاذ پر ایک کلیدی اور مرکزی کردار ادا کر رہے تھے۔ شمالی کوریا سے پاکستان کا ہونے والا یہ معاہدہ ایک ایسا دریچہ وا کرتا ہے جس کے ذریعے آپ دنیا کی مختلف ریاستوں کے مابین غیرقانونی اور ناجائز جوہری پھیلاؤ کے وسیع ترنیٹ ورک کو بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں جس میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا بھی ایک اہم کردار رہا ہے جہاں آ کر ریاستی اقدامات اور انفرادی اقدامات کے مابین قائم شدہ خطوط بھی دھندلانے لگتے ہیں۔

عبدالقدیر خان کے حوالے سے جوہری اسلحے اور ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کا حصول اور پھیلاؤ، بیلسٹک میزائل ٹیکنالوجی کے حصول سے مشروط اور جڑا ہوا ہے۔ عالمی سطح پر یہ رجحان موجود ہے، ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ وہ ممالک اور ریاستیں جو دہشت گردوں کے برعکس صرف بم رکھتی ہیں لیکن ان کے پاس اس بم کو لے جا کر اپنے ہدف پر گرانے کا کوئی قابل اعتبار ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ بم صرف طیاروں کی مدد ہی سے گرائے جاسکتے ہیں لیکن اس کے برعکس بیلسٹک میزائل بہت فاصلے تک جا کر دشمنوں کی دفاعی لائن کو تباہ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، آپ ان میزائلوں کو محفوظ بنکروں میں یا پھر موبائل لانچرز میں رکھ کر دشمن کے حملوں سے بچاؤ کا پیشگی اہتمام بھی کرسکتے ہیں۔ چنانچہ بیلسٹک میزائل بیش تر ممالک کے لیے قوت اور فخر کا ایک ذریعہ بن چکے ہیں جو دنیا کے کسی بھی خطے اور علاقے میں طاقت کا توازن تبدیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ بیلسٹک میزائل کی اسی اہمیت کے پیش نظر جوہری اسلحے اور ہتھیاروں کی تیاری کا پروگرام ہمیشہ بیلسٹک میزائل کی تیاری اور اس کے حصول سے ہی مشروط ہوتا ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بہرنوع بیلسٹک میزائل کی تیاری پر نہ صرف کافی بڑی رقم خرچ ہوتی ہے بلکہ یہ وقت طلب بھی ہے اور اگر کوئی ملک روایتی دھماکا خیز ہتھیاروں کے لیے انھیں استعمال کرنے کا خواہش مند ہے تو اس کا قطعاً کوئی فائدہ اور

نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ جوہری بم کو بیلسٹک میزائل سے جوڑنا بھی ایک بڑا اور اہم تکنیکی چیلنج ہوتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں امریکی سی آئی اے کو ازسرنو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ پاکستان کے بم گرانے کی اہلیت اور صلاحیت انتہائی محدود نوعیت کی ہے جو آئندہ کئی برس تک جوں کی توں رہے گی، چنانچہ فی الوقت بھی پاکستان کے پاس ایسے طیاروں یا میزائلوں کی تیاری کے حوالے سے ضروری صلاحیت اور مہارت موجود نہیں ہے۔ امریکی سی آئی اے کو اس حقیقت کا پختہ یقین تھا کہ پاکستان کو ایسے ''وارہیڈز'' کی تیاری میں کئی برس درکار ہوں گے جسے بیلسٹک میزائل کے ذریعے ہدف پر گرایا جاسکے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جب پاکستان نے میزائل ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کی بابت سوچنا شروع کیا تو اس کی نگاہیں ایف سولہ امریکی طیاروں پر جاکر ٹھہر گئیں، جو ابتدائی نوعیت کی ڈلیوری میکانزم کی غرض سے بروئے کار لائے جاسکتے تھے۔

تاہم ۱۹۹۰ء کے دوران امریکی حکومت کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں نے اس امید کو بھی دھندلا کردیا۔ بالآخر پاکستان نے مجبور ہوکر بیلسٹک میزائل ٹیکنالوجی کے حصول کی کوششیں پہلے سے زیادہ تیز کردیں۔ امریکا نے پاکستان کی فوجی امداد بند کردی تھی لہٰذا پاکستان نے اب مغرب کے بجائے مشرق کا رُخ کرلیا اور ایشیاء کے دو ایسے ممالک کی جانب دیکھنا شروع کردیا جو بیلسٹک میزائل ٹیکنالوجی کو برآمد کرنے والے اہم ترین ممالک تصور کیے جاتے تھے یعنی عوامی جمہوریہ چین اور شمالی کوریا۔

عوامی جمہوریہ چین سے ایم 11 میزائل کی فراہمی

۱۹۹۰ء کے اوائل میں سیٹلائٹ کے ذریعے موصول ہونے والی تصاویر سے یہ انکشاف ہوا کہ عوامی جمہوریہ چین نے پاکستان کو ایم-11 میزائل فراہم کیے ہیں جو ان دونوں ممالک کے مابین ۱۹۸۷ء میں ہونے والے ایک معاہدے کا نتیجہ تھے۔ ان

میزائلوں کو پاکستان کے کسی ایئربیس میں بند کرکے رکھ دیا گیا تھا جو لاہور کے مغرب میں واقع تھا تاکہ امریکی پابندیوں کے لیے کوئی جواز فراہم نہ ہوسکے اور عوامی جمہوریہ چین بھی عالمی دباؤ سے محفوظ رہے۔ عوامی جمہوریہ چین نے راولپنڈی سے نزدیک ایک فیکٹری کی تعمیر میں بھی پاکستان کو مدد فراہم کی تھی جہاں ایم-11 میزائل تیار کیے جاتے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے وسط میں جب یہ خبر عام ہوگئی تو امریکی کانگریس نے پرزور مطالبہ کردیا کہ چین یا پاکستان میں سے کسی ایک پر پابندیاں عائد کردی جائیں لیکن بل کلنٹن کی حکومت ایسے کسی بھی اقدام گریزاں تھی کیونکہ وہ ان دونوں ممالک سے بہتر تعلقات کے قیام کی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھی۔ بل کلنٹن حکومت کے اس اقدام سے امریکی سی آئی اے کے ان افسران میں شدید مایوسی اور بددلی پھیل گئی جو جوہری عدم پھیلاؤ کے زبردست حامی تصور کیے جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکی حکومت اپنی پالیسیوں کی صورت گری کے لیے امریکی انٹیلی جنس پر بہت زیادہ دباؤ ڈال رہی ہے تاکہ وہ بھی حکومتی پالیسیوں کے مطابق ہی اپنی پالیسیاں تشکیل دیتی رہے۔ بہرکیف عوامی جمہوریہ چین کی حکومت کو سن گن مل چکی تھی کہ امریکی انتظامیہ کسی بھی لمحے کوئی سخت فیصلہ کرسکتی ہے چناں رفتہ رفتہ اس نے میزائلوں کے پھیلاؤ میں اپنے سرگرم کردار کو محدود کرنا شروع کردیا لہٰذا اب پاکستان کو طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کے حصول کی غرض سے کسی اور جانب دیکھنا پڑا۔

شمالی کوریا کے تیار کردہ میزائل جنہیں ''نوڈونگ'' کا مقامی نام دیا گیا تھا پاکستان کی ضروریات کو پورا کرسکتے تھے، اس کے علاوہ شمالی کوریا بیلسٹک میزائل ٹیکنالوجی کو فروخت کرنے کا ایک قابل اعتماد ذریعہ بھی ہوسکتا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں شمالی کوریا نے ایران کو اس شعبے میں خصوصی تعاون فراہم کیا تھا اور وہ نقد رقومات کے عوض کچھ بھی فروخت کرنے کے لیے آمادہ ہوسکتا تھا کیونکہ شمالی کوریا کو پیسے کی اشد ضرورت تھی۔

چنانچہ شمالی کوریا نے میزائل ٹیکنالوجی پاکستان، ایران، مصر، عراق، لیبیا، شام اور یمن کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس ٹیکنالوجی کی بنیاد مصر سے حاصل کردہ ان اسکڈ میزائل ٹیکنالوجی پر رکھی گئی تھی جو سوویت یونین نے مصر کو دیے تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان دو محاذوں پر کام کررہے تھے یعنی وہ بم بھی فراہم کر رہے تھے جس کی ڈلیوری کے ذریعے کے طور پر شمالی کوریا انھیں میزائل ٹیکنالوجی دے رہا تھا جو اس نے پاکستان کے علاوہ لیبیا اور ایران کو بھی فروخت کی تھی۔ یہ پورا عمل ان لوگوں کے لیے باعث تشویش تھا جو ایٹمی پھیلاؤ کو بڑھنے سے روکنے کے خواہاں تھے۔ پاکستان اور شمالی کوریا کے مابین روایتی اسلحے اور ہتھیاروں کے تبادلے کا سلسلہ ۱۹۷۱ء سے جاری تھا جب ذوالفقار علی بھٹو نے پیانگ یانگ سے مدد چاہتے ہوئے عندیہ ظاہر کیا تھا کہ وہ پاکستان کے روایتی اسلحے اور ہتھیاروں کو جدید اور نئے ہتھیاروں سے بدلنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے دوران شمالی کوریا اور پاکستان کے تعلقات بے حد قریبی ہو چکے تھے کیونکہ یہ دونوں ممالک ایران کو مدد فراہم کر رہے تھے۔ یہاں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ پاکستان اور شمالی کوریا کے انجینئروں نے باہمی طور پر مل جل کر ایران کے میزائل پروگرام کے لیے مشترکہ مشیروں کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔

شمالی کوریا سے میزائل ٹیکنالوجی کی خریداری

پاکستان کے جوہری پروگرام کے حوالے سے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور خان ریسرچ لیبارٹریز کے مابین پیدا ہونے والی افسر شاہی رقابتوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے لیے علیحدہ میزائل پروگرام تشکیل دے رکھا تھا۔ پاکستان کا اٹامک انرجی کمیشن عوامی جمہوریہ چین کے ایم-11 میزائل پروگرام پر عملدرآمد کر رہا تھا جبکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان چاہتے تھے کہ اپنا علیحدہ اور متوازی میزائل سسٹم تشکیل دیں جس کے پس پشت ان کی عزت و وقار احترام اور مرتبے کے علاوہ یہ

احساس بھی کارفرما تھا کہ اگر انھوں نے اپنا علیحدہ متوازی میزائل پروگرام شروع کیا تو اس کے ساتھ انھیں بہت بڑی رقومات بھی حاصل ہو سکیں گی۔ بہر صورت ۱۹۸۰ء کا پورا عشرہ اسی کوشش اور جدوجہد میں گزر گیا جس میں وہ آخر کار کامیاب ہو گئے اور شمالی کوریا سے تعلقات کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کرنے لگے۔ اس سلسلے میں وہ متعدد بار شمالی کوریا کے صدر مقام پیانگ یانگ آتے جاتے رہے تاکہ میزائل ٹیکنالوجی کی بابت شمالی کوریا کے تجربے اور اہلیت سے مستفید ہوتے ہوئے اس ملک سے گہرے اور پائیدار روابط قائم کر سکیں۔

۱۹۹۲ء میں پاکستانی افسران نے شمالی کوریا کا دورہ کیا تاکہ اس کے تیار کردہ میزائل "نوڈونگ" کا نمونہ دیکھ سکیں جس کے بعد ۱۹۹۳ء میں پاکستانی اور ایرانی ماہرین کی موجودگی میں شمالی کوریا کے ساختہ میزائل کی آزمائش کی گئی۔

چنانچہ پاکستان کی مسلح افواج اور خان ریسرچ لیبارٹریز دونوں اس بات کے لیے سرگرمی کے ساتھ کوشاں تھے کہ کسی طرح شمالی کوریا کے ساختہ "نوڈونگ" میزائل کی ٹیکنالوجی کو حاصل کرلیا جائے جو طویل فاصلے تک مار کرنے والا میزائل تھا اور بھارت کے بیش تر اہداف کو تباہ و برباد کرسکتا تھا۔ بے نظیر بھٹو کو ان کے خاندانی پس منظر اور ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کے مدنظر شمالی کوریا نے میزائل ٹیکنالوجی خریدنے والوں میں شامل کرلیا تھا۔ اپنے پہلے دور اقتدار کے تجربات سے بے نظیر بھٹو نے جو سبق سیکھا تھا وہ یہ تھا کہ جب تک وہ پاکستان کی مسلح افواج اور انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم نہیں کریں گی اس وقت تک اقتدار میں زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکیں گی، چنانچہ اپنے دوسرے دور اقتدار میں انھوں نے مسلح افواج اور آئی ایس آئی کے ساتھ زیادہ قریبی تعلقات قائم کیے۔ بے نظیر بھٹو اپنے آپ کو بالکل اسی طرح پاکستان کے "میزائل پروگرام کی ماں" قرار دیتی رہی ہیں جس طرح ذوالفقار علی بھٹو اپنے آپ کو

پاکستان کے "جوہری پروگرام کا باپ" قرار دیا کرتے تھے۔ ۱۹۹۳ء میں شمالی کوریا کے ساتھ ہونے والے معاہدے اور میزائل نوڈونگ کی ٹیکنالوجی کے حوالے سے بے نظیر بھٹو نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ شمالی کوریا کو اس میزائل ٹیکنالوجی کی فروخت کے عوض دی جانے والی نقد رقم ایک خفیہ اکاؤنٹ سے دی گئی تھی۔ بقول بے نظیر بھٹو "جب شمالی کوریا کے دورے پر گئی تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے مجھے بتایا کہ ہم شمالی کوریا سے میزائل ٹیکنالوجی حاصل کر سکتے ہیں تاکہ اس سے اپنی میزائل ٹیکنالوجی کا موازنہ اور مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ میں نے ان کے لیڈر کم ال سنگ سے اس موضوع پر بات چیت کی جس پر وہ رضامند ہو گئے۔ چونکہ انھیں پیسے کی اشد ضرورت تھی اس لیے وہ یہ میزائل ٹیکنالوجی پاکستان کو فروخت کرنے پر آمادہ تھے۔" لہٰذا اب یہ بات واضح اور صاف ہو جانی چاہیے کہ پاکستان اور شمالی کوریا کے مابین کسی بھی قسم کی میزائل ٹیکنالوجی کا کوئی تبادلہ نہیں ہوا تھا بلکہ نقد رقم دے کر شمالی کوریا سے یہ ٹیکنالوجی خریدی گئی تھی۔ میزائل ٹیکنالوجی کے تبادلے کا کوئی ذکر ان مذاکرات کے دوران نہیں آیا۔

غوری میزائل

شمالی کوریا سے خریدی جانے والی میزائل ٹیکنالوجی کی مدد سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے "غوری میزائل" تیار کر لیا جو بارہویں صدی کے ایک مسلمان فاتح شہاب الدین غوری کے نام پر رکھا گیا تھا جس نے ہندوؤں کو شکست دی تھی۔ بہرنوع ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہمیشہ یہی دعویٰ کرتے رہے کہ "غوری میزائل" سراسر ان کی اپنی تیار کردہ ٹیکنالوجی کا کارنامہ ہے اور شمالی کوریا سے خریدی گئی ٹیکنالوجی کا اس میں قطعاً کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

شمالی کوریا سے ٹیکنالوجی کا تبادلہ

۱۹۹۶ء-۱۹۹۷ء کے دوران پاکستان غیر ملکی زرمبادلہ کے انتہائی شدید بحران میں

مبتلا تھا۔ غیر ملکی زرمبادلہ کا فقدان خطرے کی حد کو چھو رہا تھا۔ پاکستان نادہندہ ملک ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا، چنانچہ اس نے خوراک، مشینری اور تیل کی فروخت شروع کر دی۔ یہ اسی زمانے کا قصہ ہے جب عبدالقدیر خان اور پیانگ یانگ کے مابین روابط بڑھتے چلے گئے اور پاکستان سے ٹرانسپورٹ طیارے تواتر کے ساتھ شمالی کوریا جانے لگے۔ اشیاء اور سازوسامان کے باہمی تبادلے یعنی "بارٹر کا نظام" ان دونوں ملکوں کے اپنے مفاد میں تھا کیونکہ دونوں کے پاس ایسی ٹیکنالوجی موجود تھی جس کی فریقین کو اشد ضرورت تھی۔ جبکہ اس کے عوض کسی قسم کی نقد رقم کی ادائیگی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ۱۹۹۸ء تک پاکستان سے مہینے میں نو پروازیں شمالی کوریا جانے لگیں جن کے ذریعے شمالی کوریا سے میزائل نوڈونگ کے تکنیکی اجزاء اور پرزے پاکستان لائے جاتے تھے۔ دسمبر ۱۹۹۷ء میں پاکستان کے چیف آف دی آرمی اسٹاف جنرل جہانگیر کرامت نے بھی پیانگ یانگ کا دورہ کیا جس کے بعد یہ آثار اور علامات واضح طور پر نظر آنے لگیں کہ شمالی کوریا کا یورینیم کو افزودہ کرنے کا پروگرام نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس واقعے کا کوئی براہ راست ثبوت یا دیگر شواہد موجود نہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ جنرل جہانگیر کرامت کے دورے کے بعد ہی تبادلے کا یہ سلسلہ شروع ہوا ہوگا یعنی شمالی کوریا سے بیلسٹک میزائل ٹیکنالوجی کے عوض اسے یورینیم کی افزودگی کی ٹیکنالوجی فراہم کرنا۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ۱۹۹۷ء سے شمالی کوریا کے تیرہ دورے کیے جہاں وہ اس سے قبل بھی جاتے رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ اکیلے ہی روانہ ہو جاتے، کبھی ان کے ہمراہ ایک بڑا وفد بھی ہوا کرتا تھا۔ جولائی ۲۰۰۲ء تک یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اس زمانے میں بھی شمالی کوریا کے دورے پر جایا کرتے تھے جب جنرل پرویز مشرف مسلح افواج کے چیف آف آرمی اسٹاف اور بعد میں پاکستان کے

صدارتی منصب پر فائز ہو چکے تھے تاہم پرویز مشرف ہمیشہ اس کی تردید کرتے رہے اور بالآخر انھوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اس زمانے میں کوئی ایک درجن سینٹری فیوجز شمالی کوریا کو روانہ کیے گئے تھے۔ ایک اور موقع پر جنرل مشرف نے سینٹری فیوجز کی تعداد بیس بتائی تھی۔ سینٹری فیوجز کے ساتھ ان کے ڈیزائن اور بلیو پرنٹس بھی شمالی کوریا کو دیے گئے تھے۔ جنرل مشرف نے بعدازاں یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے "یورینیم ہیکسا فلورائڈ" بھی شمالی کوریا کو روانہ کیا تھا۔ تاہم ان کا کہنا تھا کہ چینی ہتھیاروں کے ڈیزائن کے تبادلے کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ بہرطور یہ بات بھی دلچسپی اور حیرت سے خالی نہیں کہ پیانگ یانگ میں اعلیٰ سطح کے بیشتر پاکستانی سفراء اور سفارت کاروں کا تعلق آئی ایس آئی سے رہا ہے اور اس انٹیلی جنس ایجنسی کے سابق سینئر افسران کو شمالی کوریا میں تعینات کیا جاتا رہا ہے۔ پاکستان اور شمالی کوریا کے مابین تعلقات کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب پاکستان نے ۱۹۹۸ء میں اپنا پہلا ایٹمی دھماکا کیا تو شمالی کوریا کے حکام نے اس پر اپنی غیر معمولی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے فخریہ انداز میں بیان کیا تھا۔

شمالی کوریا کے سفارت کار کی بیوی کا قتل

ابھی پاکستان کو اپنا ایٹمی دھماکا کیے ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا کہ ایک پراسرار واقعہ رونما ہوگیا۔ اسلام آباد میں شمالی کوریا کے ایک سفارت کار کی بیوی کو گھر میں گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ فائرنگ اور قتل کا یہ واقعہ اسلام آباد میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ہوا تھا۔ جس گھر میں یہ سانحہ رونما ہوا اس کی بابت بتایا جاتا ہے کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا مہمان خانہ تھا جہاں ان کے مہمان ٹھہرا کرتے تھے۔

پاکستان کے متعلقہ سرکاری حکام نے اس واقعے کو محض اتفاقیہ قرار دے کر ٹالنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہمسائے کے مکان میں موجود باورچی نے غلطی سے فائر کردیا تھا جو

اس بدقسمت خاتون کی جان لینے کا سبب بن گیا۔ تاہم اس واقعے پر کسی کو بھی یقین نہ آیا کیونکہ بہت جلد اسلام آباد میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ اس کوریائی خاتون کو جاسوس ہونے کے شبہے میں قتل کیا گیا ہے کیونکہ مغربی سفارت کاروں سے وہ برابر رابطے میں تھی اور اسلام آباد اور پیانگ یانگ کے مابین ہونے والے رابطوں اور معاہدوں کی خبریں ان مغربی سفارت کاروں تک پہنچایا کرتی تھی۔ اس کا شوہر اسلام آباد میں واقع شمالی کوریا کے سفارت خانے میں بظاہر اقتصادی کونسلر کی حیثیت سے تعینات تھا لیکن خفیہ طور پر پاکستان اور شمالی کوریا کے درمیان ہتھیاروں کے تبادلے اور سودوں میں ایک کلیدی کردار ادا کر رہا تھا، چنانچہ خان ریسرچ لیبارٹریز کے ساتھ ہونے والے تمام سودوں کی نگرانی بھی وہی کیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب پاکستان نے ۱۹۹۸ء میں چاغی کے مقام پر اپنا پہلا ایٹمی دھماکا کیا تو شمالی کوریا کا یہ سفارتی افسر بھی وہیں موجود تھا۔ مزید برآں خان ریسرچ لیبارٹریز کے تکنیک کار اکثر اوقات اس کے گھر بھی آیا جایا کرتے تھے۔ بہرحال اس کی بیوی کے قتل کو پاکستانی حکام نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ دبا دیا۔ قتل کے تین روز بعد اس خاتون کی میت کو شمالی کوریا لے جایا گیا۔ پاکستانی فوج کے ایک افسر نے جو اسی جہاز پر سوار تھا جاپانی ٹیلی وژن کے نمائندے کو بتایا کہ وہ پاکستان ایئرفورس کے بوئنگ ۷۰۷ پر سوار تھا جو اس شمالی کوریائی خاتون کی میت کو لے جا رہا تھا۔ جہاز کی روانگی سے کچھ پہلے اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی اسی پرواز سے شمالی کوریا جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ سامان کے پانچ بڑے بڑے کریٹ بھی تھے جنھیں دیکھنے اور چیک کرنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ پاکستان کی مسلح افواج کی مرضی ڈاکٹر خان کے اس دورے میں شامل تھی۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ شمالی کوریا کے سفارت کار کی اہلیہ کی میت کے ساتھ P-I اور P-II سینٹری فیوجز کے علاوہ یورینیم ہیکسا فلورائڈ کا تکنیکی ڈیٹا اور ڈرائنگز بھی شمالی کوریا لے جائی جا رہی تھی۔

اُردن: ۷راگست ۱۹۹۵ء

صدام حسین کے داماد، اُردن کی پناہ میں

سیاہ لیموزین کاروں کا ایک قافلہ اُردن کے صدر مقام عمان کے شاندار ہوٹل کے مرکزی دروازے پر آ کر رکا۔ کاروں کے دروازے کھلنے پر بعض پُراسرار قسم کے افراد نہایت بدحواسی کے عالم میں برآمد ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کہیں سے فرار ہو کر عمان آنے والے یہ پراسرار لوگ کون تھے اور یہاں کیوں آئے تھے؟؟؟ دراصل یہ قافلہ عراق کے مرحوم صدر صدام حسین کی بیٹیوں، ان کے بچوں اور دامادوں پر مشتمل تھا۔ بغداد کے دو انتہائی بااثر ورسوخ افراد یعنی صدام حسین کے دونوں داماد عراق سے بھاگ کر اُردن پہنچے تھے کیونکہ ان کے صدام حسین کے دونوں سفاک بیٹوں عودے اور قصے سے شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے جنھیں اپنے باپ کی نظروں میں ان دنوں نہایت بلند مقام اور مرتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ صدام حسین کا ایک داماد جس کا نام حسین کامل تھا بڑی اہمیت کا حامل تھا بلکہ سینئر برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس افسران نے اس سے خصوصی ملاقاتیں کر کے نہایت اہم معلومات بھی حاصل کی تھیں کیونکہ وہ عراق کے ''ملٹری انڈسٹریل کمیشن'' کا انچارج ہونے کے ناتے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی بابت بہت کچھ جانتا تھا۔ بہرنوع بعد میں حسین کامل نے عراق واپس جانے کا فیصلہ کر لیا جہاں صدام حسین کے بیٹوں نے اسے موقع ملتے ہی قتل کر ڈالا۔ اُردن میں قیام کے دوران اس نے برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس اداروں کو جو معلومات اور اطلاعات فراہم کی تھیں ان کی روشنی میں تحقیقات اور تفتیش کے کئی دروازے کھل گئے تھے جن میں عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے حوالے سے بھی متعدد معلومات شامل تھیں۔ بغداد میں عراقی افسران نے محسوس کر لیا تھا کہ انھیں سنگین خطرات درپیش ہو سکتے ہیں لہٰذا

انھوں نے اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹروں کو، مرغیوں کا وہ فارم دکھایا جو حسین کامل کی ملکیت تھا۔ ایک بہت بڑے شیڈ کے نیچے سینکڑوں، ہزاروں دستاویزات، کاغذات اور دیگر ایسے آثار چھپا کر رکھے گئے تھے جن کا تعلق عراق کی خفیہ سرگرمیوں سے تھا۔ انھیں دستاویزات میں عراق کے انٹیلی جنس افسران کی ایک یادداشت بھی موجود تھی جس پر ۶راکتوبر ۱۹۹۰ء کی تاریخ درج تھی۔ اس پر لکھا تھا ''ٹاپ سیکریٹ پرسنل'' اس یادداشت میں ایک ایسی ملاقات کا حوالہ دیا گیا تھا جو عراقی انٹیلی جنس افسران اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نمائندے کے درمیان ہوئی تھی۔ اس پراسرار اور خفیہ دستاویز میں لکھا تھا ''ہم آپ کے لیے مندرجہ ذیل تجویز پیش کرتے ہیں جو پاکستان کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی جانب سے ہمیں موصول ہوئی ہے جس میں یہ امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ عراق کو یورینیم کی افزودگی اور جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں تعاون اور مدد فراہم کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اس بات پر بھی آمادگی ظاہر کی ہے کہ وہ جوہری بم بنانے کی غرض سے پروجیکٹ کا ڈیزائن بھی دینے کو تیار ہیں۔ اس سلسلے میں مغربی ممالک سے مواد اور دیگر ساز و سامان بھی وہ دبئی میں اپنی ذاتی کمپنی کے توسط سے منگوا کر دے سکتے ہیں۔ انھوں نے درخواست کی ہے کہ ابتدائی ٹیکنیکل میٹنگ کر لی جائے تاکہ ان دستاویزات پر مشاورت ممکن ہو سکے جو ڈاکٹر عبدالقدیر ہمارے حوالے کریں گے؟'' اس تجویز کے پیچھے درحقیقت اپنے لیے اور اپنے نمائندے کے لیے رقم حاصل کرنے کا منصوبہ موجود تھا تاکہ عراقی حکومت کو یورینیم افزودگی اور جوہری ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی فراہم کرنے کے عوض منافع کی بھاری رقومات حاصل کی جا سکیں۔ اس تجویز کے آخر میں درخواست کی گئی ہے کہ اس پر نظرثانی کے بعد فیصلے سے آگاہ کیا جائے۔ ایک اور دستاویز میں ان آئٹمز کی ایک فہرست موجود تھی جو برائے فروخت تھے جس پر پانچ ملین ڈالرز کی رقم بطور قیمت خرید درج تھی...... جس پر دس فیصد کمیشن دیے جانے کا بھی تذکرہ

کیا گیا تھا......

۱۹۸۷ء کے دوران ایران کو بھی کم وبیش یہی پیشکش کی گئی تھی لیکن ایرانی حکومت کا کہنا ہے کہ اُسے جوہری ہتھیاروں کے ڈیزائن کی بابت کوئی تجویز موصول نہیں ہوئی تھی۔ لیبیا کو شروع میں انھی خطوط پر یورینیم افزودگی اور جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں مدد کی پیشکش کی گئی تھی۔ بہرکیف! ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا اصل مقصد تو جوہری ٹیکنالوجی کو فروخت کرنا تھا خواہ کوئی بھی اس کا خریدار ہو!!! ایران خریدے یا عراق، ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا حالانکہ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ اس بات سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے محرکات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس میں ڈاکٹر خان کا کوئی اسٹریٹجک مفاد پوشیدہ نہ تھا بلکہ محض روپے پیسے کی ہوس کارفرما تھی جس کے عوض وہ یہ ٹیکنالوجی ہر کسی کو فروخت کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جتنے زیادہ ممالک ان کے نیٹ ورک سے یہ ٹیکنالوجی خریدیں گے اتنی ہی زیادہ اس کی مانگ بڑھے گی اور دیگر اقوام اور ممالک بھی اس میں اپنی دلچسپی ظاہر کریں گے۔

عراق کا جوہری ہتھیار تیار کرنے کا پروگرام

۱۹۷۰ء کے اواخر سے عراق جوہری ہتھیاروں کی تیاری کا پروگرام بنا رہا تھا تاہم اسرائیل کے حملے اور عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی کے نتیجے میں عراق کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اسرائیل کے اس حملے کے بعد صدام حسین نے اس پروگرام کی پیش رفت کو جاری تو رکھا لیکن نہایت خفیہ اور پوشیدہ طریقے سے۔ چنانچہ جب ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے بعد اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹرز عراق آئے تو انھیں یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ عراق اس سمت میں بہت آگے تک پیش قدمی کر چکا ہے اور بڑی کامیابی سے ایک خفیہ پروگرام پر عملدرآمد کرنے میں مصروف ہے جو پاکستان سے کافی ملتا جلتا ہے۔ عراقی

حکومت نے بھی یورینکو والے ڈیزائن ہی حاصل کر رکھے تھے لیکن انھیں غالباً کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی جن کمپنیوں نے عبدالقدیر خان نیٹ ورک کو ساز وسامان اور پرزے فراہم کیے تھے انھی سے عراق نے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔ بہرنوع ۱۹۹۵ء میں حسین کامل کے مرغیوں کے فارم سے بین الاقوامی اسلحہ انسپکٹروں کو جو دستاویزات اور کاغذات ملے انھیں دیکھنے اور پڑھنے کے بعد ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں، چنانچہ انھوں نے عراقی افسران سے استفسار کیا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ انھوں نے انسپکٹرز کو بتایا کہ عراقی انٹیلی جنس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا کیونکہ انھیں شبہ ہوگیا تھا کہ یہ کارروائی درحقیقت مغربی انٹیلی جنس اداروں کی ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ عراق جوہری ٹیکنالوجی کے حصول کی کس منزل اور مرحلے میں ہے تاہم ایک خیال یہ بھی ہے کہ ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے سبب اس ضمن میں کوئی ٹھوس پیش رفت نہیں ہوسکی۔ بہرطور ان انسپکٹرز کی جانب سے کی جانے والی تمام تحقیقاتی کوششوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ پاکستانی حکومت سے بھی اس ضمن میں متعدد سوالات کیے گئے لیکن اُس نے حلفیہ طور پر بتایا کہ عراق کو ایسی کوئی پیش کش سرے سے کی ہی نہیں گئی لہٰذا اس نوعیت کے سوالات کا قطعاً کوئی جواز بھی موجود نہیں ہے۔ اس واقعے کے دس برس بعد جب ایک سینئر انسپکٹر لیبیا پہنچا تو اس نے اچانک محسوس کیا کہ عراق کو کی جانے والی پیشکش بے بنیاد اور غلط نہ تھی اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان عراقی حکومت کو وہ سب کچھ دینے کو تیار تھے جس کی پیشکش انھوں نے اپنے ایک نمائندے کے ذریعے کی تھی تاہم وقتی طور پر صحیح موقع کو گنوا دیا گیا تھا۔ دوسری جانب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا نیٹ ورک مزید سودوں اور معاہدوں کے نتیجے میں توسیع اور خوشحالی کی جانب گامزن تھا۔

عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی توسیع: لیبیا کی حکومت سے معاہدہ

جوہری ٹیکنالوجی کے عالمی سیلز مین کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے اواخر سے وہ جوہری پھیلاؤ کی پُراسرار دنیا کے ایک جانے پہچانے چہرے کے طور پر مشہور ہو چکے تھے۔ پوری دنیا اس حقیقت سے آشنا ہو چکی تھی کہ یہی وہ شخص ہے جو یہ کام کر سکتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے اواخر سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے غیر ملکی دوروں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جس کا دائرہ شمالی افریقا سے مشرق وسطیٰ اور ایشیاء تک پھیلا ہوا تھا۔ ان دوروں میں وہ حکومتی اہلکاروں کے علاوہ ہر اس شخص سے ملاقات کیا کرتے تھے جو اس ٹیکنالوجی کی خریداری میں ذرا سی بھی دلچسپی ظاہر کیا کرتا تھا۔ کچھ افسران اور سرکاری حکام ایسے بھی تھے جو ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے اس موضوع پر بات چیت تو کر لیا کرتے تھے لیکن ان سے کسی لین دین یا معاہدے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے کیونکہ ایک تو انھیں پکڑے جانے کا خوف لاحق تھا دوسرے وہ ان فائدوں کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر تھے جو ایٹمی ٹیکنالوجی خریدنے کے نتیجے میں انھیں حاصل ہو سکتے تھے جبکہ بعض دوسرے ممالک ایسے تھے جو بلاخوف وخطران سے معاہدہ کرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا نیٹ ورک بھی بدستور تیزی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا اور چوں کہ اب تک وہ کسی کی نظر میں نہیں آئے تھے اور ان کی تمام سرگرمیاں صیغۂ راز میں تھیں لہٰذا ان کی ہمت اور حوصلے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تاہم ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے دنیا کو یہ بتانے میں بھی کسی تکلف یا پردہ پوشی سے کام نہیں لیا کہ وہ کن سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ وہ بالعموم اپنے موضوع سے متعلق رسائل وجرائد میں بعض اوقات نہایت فخر اور گھمنڈ کے ساتھ یہ لکھنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتے تھے کہ انھوں نے کتنا عظیم اور شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ دراصل وہ اپنے ان مضامین اور آرٹیکلز کو بلامعاوضہ اشتہارات کی ایک شکل تصور کرتے تھے جو ان کے مقاصد

کے فروغ میں ان کی مدد کرتے ہوئے جوہری ٹیکنالوجی کی فروخت میں کارآمد ثابت ہو سکتے تھے لیکن ۱۹۹۰ء کے آخر میں وہ مزید آگے بڑھ گئے۔ اب خان ریسرچ لیبارٹریز کی جانب سے پوری دنیا میں منعقد ہونے والی اسلحے اور ہتھیاروں کی نمائش میں بوتھ قائم کیے جانے لگے جس میں یہ اشتہار موجود ہوا کرتے تھے کہ کے آر ایل نہ صرف روایتی قسم کے ہتھیار اور اسلحے کو فروخت کرتا ہے بلکہ سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کے حصول میں بھی مددگار ہوگا۔ اس سلسلے میں مخصوص قسم کے بروشر بھی تقسیم کیے جاتے تھے جن پر فخریہ طور سے حکومت پاکستان کی مہر ثبت ہوا کرتی تھی۔ ایسے کیٹلاگ بھی تقسیم کیے گئے جن میں جوہری پروگرام کی تکمیل کے لیے تمام ضروری اور مطلوبہ اشیاء، پرزوں اور ساز و سامان کی ایک فہرست درج تھی جس میں مکمل طور پر الٹرا سینٹری فیوج مشینیں بھی شامل تھیں۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو اسے کہہ دیا جاتا کہ ان چیزوں کو غیر ملکیوں کو فروخت کرنے میں قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ خود پاکستانی حکومت بھی اس کام میں کھلم کھلا شریک ہوگئی، چنانچہ ۲۰۰۰ء کے دوران پاکستان کے مقامی اخبارات میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں خصوصی جوہری مہارت اور مواد کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس اشتہار کی اشاعت نے ایسے تشویشناک سوالات کو جنم دیا جن کا تعلق جوہری پھیلاؤ کے حوالے سے حکومتی رویے کو تنقید اور نکتہ چینی کا نشانہ بنانا تھا۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے جنرل مرزا اسلم بیگ کا کہنا ہے کہ "یہ کوئی خفیہ بات نہ تھی یہ پورے صفحے کا اشتہار تھا جو حکومت پاکستان کی جانب سے اشاعت کی غرض سے اخبارات کو جاری کیا گیا تھا۔ پاکستان کے پاس یہ تمام آئٹم موجود تھے جنھیں فروخت کے لیے پیش کیا گیا تھا یہ ممنوعہ آئٹم نہ تھے اور جو کوئی چاہے انھیں دیکھ کر تصدیق کر سکتا تھا لہٰذا اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔"

بہرکیف! کے آر ایل نے نصف گھنٹے دورانیے کی ایک ویڈیو فلم بھی تیار کی تھی جس میں جوہری ٹیکنالوجی کے حوالے سے اُس کے کارناموں کا ذکر تھا تاکہ یہ اشتہاری ویڈیو فلم

کے آرایل کے تجارتی مقاصد کے فروغ میں مدد دے سکے۔ اس ویڈیو فلم میں کہوٹہ کے اندرونی حصوں کے شاٹ لیے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اپنے کارناموں کی تفصیل بتاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ ویڈیو صرف ان افراد کو دی گئی جو کے آرایل کے ممکنہ گاہک ہو سکتے تھے۔

لیبیا کے حکام سے ملاقاتیں

بہرنوع ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے متعدد رابطوں پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ ۱۹۹۰ء کے وسط میں غالباً اس سے پہلے ایک ایسا ملک جو تقریباً بیس برس قبل پاکستان کے جوہری پروگرام کے آغاز کا سبب بن گیا تھا دوبارہ رابطے میں آ گیا، چنانچہ ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر خان نے لیبیا کے حکام سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا جنھوں نے ڈاکٹر خان سے ان کی شہرت کے بارے میں سن کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کلیدی ملاقاتوں اور اجلاسوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان خود بھی بہ نفسِ نفیس موجود رہا کرتے تھے جن میں ان کا نائب بی ایس طاہر بھی ان کے ہمراہ ہوا کرتا تھا۔ طاہر کے بقول ان کی ملاقات لیبیا کے دو حکام سے ہوئی تھی جن میں سے ایک کا نام کریم اور دوسرے کا محمد تھا جو لیبیا کے لیے جوہری صلاحیت حاصل کرنے کے آرزومند تھے اور اس مقصد سے ڈاکٹر خان سے ملاقات کر رہے تھے۔ آئندہ پانچ برس تک گفت و شنید کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا، ایک بار کیسابلانکا میں اور متعدد بار دبئی میں یہ ملاقاتیں تواتر کے ساتھ ہوتی رہیں۔ لیبیا کے لیڈر کرنل معمر قذافی طویل عرصے سے جوہری ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے خواہاں تھے جس کے نتیجے میں وہ عرب دنیا اور افریقی ممالک کے امور میں اپنا ایک مستحکم ذاتی امیج قائم کرنے کے علاوہ آئندہ چل کر امریکی حکومت کو یہ تاثر بھی دینا چاہتے تھے کہ لیبیا سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں اور اس کی حکومت کا تختہ الٹنا اب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کرنل قذافی کی یہ دیرینہ آرزو ذوالفقار علی بھٹو کے روپ میں پوری ہوتی دکھائی

دینے لگی اور انھوں نے بھٹو کو اپنے اس خواب کی تعبیر سمجھ کر نائیجیریا سے یورینیم بھی درآمد کرنا شروع کر دیا تاہم یہ کوششیں بارآور ثابت نہ ہو سکیں لیکن انھوں نے اپنی جستجو اور تلاش کو ترک ہرگز نہیں کیا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں امریکی حکومت نے لیبیا پر سخت پابندیاں عائد کر دیں کیونکہ وہ دہشت گردوں کو تائید و حمایت اور مدد فراہم کر رہا تھا، چنانچہ لیبیا نے بلیک مارکیٹ سے جوہری ٹیکنالوجی خریدنے کی بابت سوچنا شروع کر دیا اور افراتفری کے عالم میں جو کچھ ملتا گیا اُسے خریدنا شروع کر دیا لیکن اس خریداری کے بعد بھی لیبیا اس پوزیشن میں نہ تھا کہ ایٹم بم بنا سکے جس نے اس کے لیے بڑے تکنیکی قسم کے مسائل پیدا کر دیے تھے۔ لیبیا کے پاس ضروری اور مطلوبہ اہلیت اور مہارت موجود نہ تھی جس کی مدد سے وہ ایٹم بم بنا سکتا جبکہ عالمی مارکیٹ اتنی منقسم تھی کہ وہ یہ مہارت فراہم کرنے سے قاصر تھی۔ ۱۹۸۴ء کے دوران لیبیا نے بلیک مارکیٹ سے ایسی مشینیں خرید لی تھیں جن کے ذریعے یورینیم کو افزودہ کیا جا سکتا تھا چونکہ ان مشینوں کو جوڑنے اور ان کو استعمال کرنے کی مطلوبہ صلاحیت لیبیا کے پاس نہ تھی لہٰذا وہ کئی برس تک یونہی گوداموں میں پڑی رہیں۔ دس برس تک لگاتار کوشش کے باوجود لیبیا ایک بھی قابلِ عمل سینٹری فیوج نہیں بنا سکا۔ بہرطور جولائی ۱۹۹۵ء میں کرنل قذافی نے دوبارہ کوشش کرنے کا اہم فیصلہ کر لیا، ان کا خیال تھا کہ لیبیا کو سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے براہِ راست رابطہ کر کے صرف انھی کے ساتھ معاہدہ کر لینا چاہیے تاکہ وہ صحیح ساز و سامان اور اجزاء کی نشاندہی کر سکیں جو ایٹم بم کی تیاری میں ضروری ہیں، چنانچہ لیبیا کی حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ بلیک مارکیٹ سے ٹکڑوں میں خریداری کرنے کے بجائے کیوں نہ کسی ایک ہی ملک سے معاہدہ کر کے رقم کی ادائیگی کے عوض یہ مہارت اور مشینری بمعہ پرزہ جات حاصل کر لی جائے۔ لیبیا کے متعلقہ حکام اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے مابین کامیاب مذاکرات کے بعد ۱۹۹۷ء میں ساز و سامان کی پہلی کھیپ جو بیس جوڑی گئی پی ون سینٹری

فیوج مشینوں پر مشتمل تھی پرزوں سمیت لیبیا پہنچ گئی۔

۱۹۹۷ء کے وسط میں ترکی کے شہر استنبول میں لیبیا کے نمائندے اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ملاقات کے نتیجے میں ڈاکٹر خان کو پی ۲ سینٹری فیوج مشینوں کا ایک بہت بڑا آرڈر مل گیا جس کے تحت دس ہزار مشینیں لیبیا پہنچائی جانی تھیں جو اتنا فزائل مواد تیار کرنے کے قابل تھیں جن کی مدد سے سال میں لگ بھگ دس ایٹم بم تیار کیے جاسکتے تھے۔ لیبیا سے اتنے بڑے آرڈر کے نتیجے میں گویا ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے لیے بے شمار نئے امکانات کے دروازے وا ہو چکے تھے کیونکہ اس سے قبل انھیں اتنی پرکشش پیشکش نہیں ہوئی تھی چناں چہ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ اپنے نیٹ ورک پر بھرپور توجہ دیں اور اسے نجی شعبہ کے ایک مکمل ماڈل میں تبدیل کر دیں۔ یہ ڈاکٹر خان کی شبانہ روز سرگرمیوں اور محنت کا ثمر تھا۔

بی ایس طاہر کون تھا؟؟

بی ایس طاہر نامی نوجوان اس آپریشن کو چلانے میں کلیدی کردار ادا کر رہا تھا، اس نے بہت جلد ترقی کے مدارج طے کیے تھے اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے اُس کے تعلقات اب خاندانی نوعیت کے ہو چکے تھے، وہ اسے اپنا بیٹا سمجھ کر پیش آیا کرتے تھے۔ پچھ اس سب سے بھی کہ ان کا اپنا کوئی بیٹا نہ تھا۔ خان اکثر دبئی میں بی ایس طاہر کے پاس قیام کرتے تھے۔ ڈاکٹر خان نیٹ ورک کے تمام سودے اور معاملات بی ایس طاہر ہی طے کیا کرتا تھا۔ سازوسامان، پرزوں اور اجزاء کو بھجوانا اور رقومات کی گردش سب اس کی ذمہ داری تھی۔ ڈاکٹر خان صرف اسے آرڈر کردیا کرتے تھے اور وہ اس پر عملدرآمد کیا کرتا تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا بی ایس طاہر ایک ایسا نوجوان تھا جس نے اپنی اہلیت اور صلاحیت کی بناء پر بہت جلد ترقی کا زینہ طے کرلیا تھا اور خاص بلند مقام اسے حاصل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے چچا کو بھی اپنے خاندانی کاروبار سے ہمیشہ کے لیے بے دخل

کردیا تھا۔ اب طاہر خود ایس ایم بی گروپ کا منیجنگ ڈائریکٹر بن چکا تھا۔ دبئی میں اس کا مخصوص تجارتی اور کاروباری مرکز تھا تاہم اس نے ملائیشیا سے بھی گہرے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ ۱۹۹۴ء میں وہ ملائیشیا گیا تھا اور وہاں اس نے کاروباری طبقے سے خصوصی نوعیت کے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اس نے شادی بھی چونکہ ملائیشیا کی ایک لڑکی سے کی تھی لہٰذا اب وہ مستقلاً وہاں رہائش بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اس رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ملائیشیا میں اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی رابطوں کو کافی مستحکم کرلیا تھا۔ وہ سفر کا بے حد شوقین تھا اور بالعموم دبئی اور ترکی کے درمیان سفر کرنا اس کا معمول بن چکا تھا تاہم بعد میں ملائیشیا کے حکام نے طاہر کو تحقیق و تفتیش کی غرض سے روک لیا تھا جس کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ لیبیا معاہدے میں اس کا نیٹ ورک شریک تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر نیٹ ورک کا سراغ

سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نیٹ ورک کا سراغ پہلے ہی لگا لیا گیا تھا تو امریکی انتظامیہ اور حکومت کی جانب سے انھیں روکنے کی کوئی کوشش کیوں نہیں کی گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نیٹ ورک کا دارومدار اور انحصار یورپین ممالک پر تھا۔ وہ بہت بڑے پیمانے پر یورپی ممالک سے جوہری ٹیکنالوجی اور یورینیم کی افزودگی کے مواد اور سازوسامان کی خرید و فروخت میں ملوث تھے چناں چہ امریکی حکومت کے علاوہ ان یورپی ممالک کی بھی ذمہ داری تھی کہ وہ ڈاکٹر خان کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے اور اس ممکنہ خطرے کا پیشگی ادراک کرتے جو ان کی مشکوک سرگرمیوں کے نتیجے میں پوری دنیا کو لاحق ہو سکتا تھا۔ بہرنوع حقیقت تو یہ ہے کہ یہ یورپی ممالک اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ ان کے اپنے شہریوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان کو سازوسامان اور مواد کی فراہمی میں ملوث ہے تاہم کسی بھی یورپی ملک کی حکومت نے یہ کوشش نہیں کی کہ ایسے شہریوں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے انھیں ایسی تجارت میں ملوث

ہونے سے باز رکھے۔

برطانیہ: خان نیٹ ورک کا اہم مرکز

برطانیہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے کاروبار اور تجارت کا بڑا اہم مرکز تھا جہاں سے نیٹ ورک کے بڑے آپریشن اور پاکستان کے لیے شپمنٹ وغیرہ کا تمام تر کام انجام دیا جاتا تھا۔ لندن کا پاکستانی مشن ان سرگرمیوں کا مرکز تھا چنانچہ جب ڈاکٹر خان کے ایک کارندے کو گرفتار کر لیا گیا تو ڈاکٹر خان نے سینیئر سفارت کاروں سے کہا کہ وہ اسے رہائی دلوانے کے لیے تمام کوششوں کو بروئے کار لائیں۔ اسی طرح ایک اور واقعہ میں جو ۲۰۰۱ء میں پیش آیا تھا ایک تاجر ابوبکر صدیقی کو ایک برطانوی عدالت نے اس جرم میں سزا سنائی کہ وہ جوہری ٹیکنالوجی سے متعلقہ اشیاء خان ریسرچ لیبارٹریز کو برآمد کر رہا تھا۔ اس طرح اس نے برآمدی قوانین کی سنگین خلاف ورزی کا ارتکاب کیا تھا۔ ابوبکر صدیقی دس سال سے یہ کاروبار کرتا چلا آ رہا تھا اور دبئی کے ذریعے ڈاکٹر خان کو میٹریل بھجوایا کرتا تھا۔ ابوبکر صدیقی دراصل ڈاکٹر خان کے دست راست پی ایس طاہر کا بزنس پارٹنر تھا۔ اسے برطانوی عدالت نے بارہ ماہ کی سزا سنائی اور فیصلے میں لکھا کہ ملزم کو اگرچہ یہ علم تھا کہ وہ عبدالقدیر خان کے ساتھ کاروبار کر رہا ہے تاہم یہ علم اسے نہیں تھا کہ پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام میں ڈاکٹر خان کا کیا کردار ہے؟

دبئی: ڈاکٹر خان نیٹ ورک کا کلیدی مقام

دبئی کو ڈاکٹر خان نیٹ ورک کے کاروبار اور تجارت کے حوالے سے مرکزی اور کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے۔ تاہم ڈاکٹر خان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اواخر سے ان کے تمام سودے اور معاہدے اسی شہر کے ذریعے اور توسط سے طے ہوئے تھے۔ دبئی کو غیر قانونی اور ناجائز تجارت کا ایک اہم مرکز تصور کیا جاتا ہے جو انیسویں صدی سے برابر ان کاموں کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی

دہائی سے دبئی کی شاہراہ شیخ زید روڈ کو جہاں ڈاکٹر عبدالقدیر نیٹ ورک کی بعض کمپنیاں قائم تھیں گرد آلود صحرائی سڑک سے تبدیل کر کے آج کی جدید ترین شاہراہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں ہر وقت ٹریفک جام رہتی ہے اور فلک بوس جدید ترین عمارتیں دبئی کے ایک ترقی یافتہ تجارتی اور کاروباری مرکز ہونے کا پتا دیتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے ایران، لیبیا، عراق اور دیگر ممالک اور افراد سے ہونے والے سودے اور معاہدے اسی شہر دبئی میں ہوئے تھے۔ پاکستان کا ایک امیر کبیر تاجر جو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا اسپانسر بھی تھا اسی دبئی شہر میں مقیم تھا، جب بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان دبئی آتے تھے تو ایئرپورٹ سے انھیں وی آئی پی چینل کے ذریعے لے جایا جاتا تھا۔

خلیج میں موجود اور مقیم انٹیلی جنس سروسز کے مطابق ڈاکٹر خان نے چار برس کے دوران چوالیس مرتبہ دبئی کا دورہ کیا، جب ۱۹۹۹ء کے آس پاس دبئی نے ان کے کاروباری مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ایران کے ساتھ معاملات طے کرنے کی غرض سے بھی دبئی نسبتاً بہترین محل وقوع کا حامل تھا۔ نیز ایران اور بیرونی دنیا کے مابین کلیدی رابطوں کا بھی اہم مرکز تھا۔ ایران کی بے شمار کمپنیاں ملٹری پروگرام کی غرض سے جوہری ٹیکنالوجی کے متعلقہ ساز و سامان اور اجزا و پرزہ جات کے لیے دبئی میں موجود رہا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر خان نے ایران سے کیے گئے سودے کی تکمیل کے لیے دبئی سے بیس مرتبہ ایران کا سفر کیا۔ لیبیا سے کیے گئے معاہدے کے حوالے سے بھی دبئی ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ ۱۹۸۰ء میں قائم ہونے والی جبل علی فری ٹریڈ زون سات سو پچاس ایکڑ پر مشتمل ہے جس سے درآمد کی جانے والی کسی بھی شے پر کوئی ڈیوٹی ادا نہیں کرنا پڑتی۔

ایک پاکستانی نوجوان سائنس دان
جوہری پھیلاؤ میں کیوں کر ملوث ہو گیا؟

۱۹۷۰ء کے اوائل میں نیدرلینڈ میں بیٹھا نوجوان پاکستانی سائنس دان جو اپنے

وطن، قوم اور ملک کی خدمت کے بے لوث جذبے سے سرشار تھا اور جس کے دل میں حب وطن کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہ اچانک پراسرار جوہری ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ اور فروخت میں کیوں اور کیسے ملوث ہوگیا؟ اس کا ایک سہل اور آسان جواب تو یہی ہے کہ یہ سب لالچ اور حرص و ہوس کا نتیجہ تھا۔ کم از کم ڈاکٹر خان کے کاروباری نیٹ ورک میں شامل افراد کا کہنا تو یہی ہے جنھیں کک بیکس، کمیشن اور معاہدوں کی صورت میں لاکھوں ڈالر ملا کرتے تھے۔ اعلیٰ ترین سطح پر کوئی درجن بھر افراد اس معاملے میں ملوث تھے۔ خان نیٹ ورک کا ہر ایک معاہدہ اور سودا انتہائی پرکشش ہوا کرتا تھا اور خود ڈاکٹر خان خاصی دولت کے مالک بن چکے تھے۔ پاکستان، دبئی اور لندن کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں ان کی جائیداد کا ایک وسیع نیٹ ورک موجود تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ہوٹلوں، ریستورانوں اور ایک نائٹ کلب میں بھی ان کی شراکت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی پر دس لاکھ امریکی ڈالر خرچ کیے تھے لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس پورے نیٹ ورک کے پیچھے صرف اور محض لالچ کا جذبہ کارفرما تھا یا کچھ اور وجوہ بھی تھیں؟ اپنی روزمرہ زندگی میں ڈاکٹر خان قطعاً ایک عیش و عشرت پسند انسان نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو ان سے پاکستان میں مل چکے ہیں انھیں بخوبی یاد ہوگا کہ اسلام آباد میں ان کا مکان، آرائش و زیبائش کے بعض نمایاں تاثرات کے باوجود ایک سادہ سا لیکن معیاری مکان تھا۔ ہاں غیر ملکی سفر پر بلاشبہ وہ غیر معمولی رقومات خرچ کرنے کے عادی تھے۔ کئی پہلوؤں سے وہ متوسط طبقے کے ایک بورژوا آدمی لگتے تھے جو بالخصوص جانوروں اور پرندوں سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی رکھتا ہو۔ انھوں نے اپنے مکان کے بیرونی حصے میں پالتو جانوروں کے لیے ایک بہت بڑی جگہ مخصوص کر رکھی تھی اور وہ کسی بھی آوارہ کتے، بلی یا پرندے کا خصوصی طور پر خیال رکھنے کے لیے مشہور تھے جو ان کے راستے میں آجایا کرتا تھا۔ ان کے دوست بتاتے ہیں

کہ جانوروں سے ان کا رویہ اور برتاؤ افراد خانہ جیسا تھا اور ان کا خیال وہ بالکل ایسے کیا کرتے تھے جیسے وہ ان کے خاندان ہی کا کوئی فرد ہو۔

کیا یہ سب کچھ کسی لالچ کا نتیجہ تھا؟

بلاشبہ لالچ ایک بنیادی محرک ضرور تھا لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ صرف ایک جزوی محرک اور جذبہ تو ہوسکتا ہے لیکن تمام تر اسے ہی ذمہ دار قرار دینا صحیح نہ ہوگا کیونکہ اگر وہ چاہتے تو پاکستان کے کرپشن زدہ معاشرے میں رہتے ہوئے بے اندازہ دولت اور روپیہ کما سکتے تھے کیونکہ اس معاشرے میں انتہائی قلیل تنخواہ پانے والے فوجی حضرات بھی لکھ پتی اور کروڑ پتی کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے بے شمار مواقع تھے جن کا فائدہ اٹھا کر وہ پاکستان کے اپنے جوہری پروگرام کے حوالے سے لاکھوں کروڑوں روپے کک بیکس اور کمیشن کے طور پر حاصل کر سکتے تھے جس کے لیے انھیں جوہری ٹیکنالوجی فروخت کرنے کا خطرہ بھی مول نہ لینا پڑتا، چنانچہ لالچ، طمع اور حرص سے کہیں زیادہ مذہب، قوم پرستی اور بین الاقوامیت کا ایک پیچیدہ امتزاج ہمارے اس سوال کا بہتر اور معقول جواب فراہم کرتا ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر خان سب سے پہلے ایک پرجوش اور اولوالعزم پاکستانی، محب وطن اور قوم پرست شخصیت کے مالک تھے جن کے دل میں بھارت سے نفرت اور مخاصمت کا زہر بھرا ہوا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام آباد میں ان کے مکان کی اسٹڈی میں اس آخری مہاجر ٹرین کی تصویر آج بھی آویزاں ہے جو تقسیم کے وقت بھارت سے آنے والے مہاجرین کو لے کر پاکستان آرہی تھی۔ یہ پینٹنگ ان کے طرز فکر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

وہ محب وطن تھے اور ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اولین ترجیح اپنی قوم، وطن اور ملک کی خدمت کرنا تھی، چنانچہ اپنے ملک کو جوہری قوت سے لیس کرنے کی

انھوں نے جو کاوش کی وہ درحقیقت مغربی ممالک اور مغربی اقوام کے خلاف ان کے شدید جذبہ نفرت کا اظہار تھا، بالخصوص دنیا بھر کے مسلمان ممالک کے جذبہ مخاصمت کا اظہار بھی کیونکہ مغربی طاقتوں کے جوہری قوت ہونے کے نتیجے میں ان ممالک کو شدید احساسِ کمتری اور کمزوری کا سامنا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اکثر کہا کرتے تھے کہ مغرب اسلامی دنیا کو ترقی کرتے اور آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ اس طرح طاقت اور قوت پر اس کی اجارہ داری کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ بعض مسلمان ملکوں نے ممنوعہ ٹیکنالوجی میں جو مہارت حاصل کر لی ہے یہ مغربی ممالک نہیں چاہتے کہ وہ کسی دوسرے مسلمان ملک کو منتقل کی جائے۔ اس مقصد سے وہ بین الاقوامی دباؤ کو استعمال میں لاتے ہیں جب کہ اس کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ خود ان مسلمان ممالک کے مابین رابطوں اور تعاون کا فقدان ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اوّل و آخر ایک دردمند پاکستانی، محبِ وطن اور مسلم بین الاقوامیت کے تصور پر گہرا اور پختہ یقین رکھنے والے شخص ہیں۔ وہ ہمیشہ مغرب کی طاقت اور اثر و رسوخ کے شدید مخالف رہے ہیں اور اسے چیلنج کرنے کی غرض سے انھوں نے ایک غیر معمولی صلاحیت کے حصول کو یقینی بنالیا تاکہ وہ مغرب کی سبقت اور بالادستی کا جواب دے سکیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان مذہبی شخصیت ضرور ہیں لیکن آپ انھیں ایک جنونی مسلمان ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ وہ خود شراب نوشی سے کوسوں دور ہیں لیکن یورپ سے آنے والے مہمانوں کے لیے ان کے گیسٹ ہاؤس میں شراب کی ایک بڑی مقدار موجود رہا کرتی تھی۔ وہ خاصی حد تک قسمت، تقدیر اور ماورائی قوتوں پر گہرا اعتقاد رکھتے ہیں اور قسمت کا احوال بتانے والوں سے ان کا باقاعدہ رابطہ رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ تو ان کے ایک رشتے دار اور بزنس پارٹنر نے قسمت کا حال بتانے والے کو محض اس مقصد سے پیسے ادا کیے کہ وہ ڈاکٹر خان کو کسی خاص بات کے لیے قائل کر سکے۔ ان کے نزدیک دیگر مسلمان ممالک کو جوہری ٹیکنالوجی کی منتقلی کا مقصد مغربی ممالک کی اجارہ

داری اور بالادستی کو ختم کرنا تھا تاکہ دنیا کے غریب، ترقی پذیر اور پسماندہ مسلمان ممالک مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا کے جتنے زیادہ ممالک کے پاس جوہری صلاحیت موجود ہوگی اسی نسبت سے اس کے پھیلاؤ کے خدشات بھی کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ اپنی مغربی تعلیم اور جنوبی افریقی نژاد و لندیزی شریک حیات ہینڈرینا کی موجودگی کے باوجود ڈاکٹر خان مغرب کے خلاف اپنی مزاحمت پر بدستور قائم رہے اور مغرب کے خلاف ان کے جذبات و احساسات میں قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک جرمن رسالے Der Speigel کے لیے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

''امریکیوں اور برطانویوں کا ہمیشہ یہ رویہ رہا ہے کہ وہ خود کو بقیہ تمام دنیا کے مقابلے میں دودھ کا دھلا سمجھتے ہیں۔ گویا یہ خدا کی جانب سے مقرر کردہ ایسے سرپرست ہیں جو خود تو جوہری ہتھیاروں کے انبار لگاتے رہتے ہیں اور ہر مہینے کوئی نہ کوئی دھماکا بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اگر ہم ایسا کوئی منصوبہ تیار کریں تو یہ ہمیں شیطان قرار دے دیتے ہیں۔''

ان کے بعض دوست احباب اور بزنس پارٹنرز بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتے تھے اور ان کا یہ کہنا تھا کہ کون سی چیز قانونی ہے اور کون سی غیر قانونی اس کا فیصلہ آخر کون کر سکتا ہے؟ خان اور ان کے احباب کے نزدیک ایٹم بم سلامتی اور تحفظ کا ضامن تھا نہ کہ کسی خطرے کی علامت اور کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا کے دیگر ممالک اس ٹیکنالوجی سے استفادہ نہ کریں؟ چوں کہ مغرب اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا لہٰذا یہ اشد ضروری تھا کہ مسلمان ممالک کے مابین وسیع تر تعاون اور روابط موجود ہوں۔

دراصل ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی مغرب مخالف سرگرمیوں کا آغاز اسی زمانے میں ہوا تھا جب ۱۹۷۰ء کے عشرے میں انھیں اور پاکستان کو جوہری ٹیکنالوجی کے حصول سے

روکنے کی کوششیں کی گئیں۔ بقول ان کے مغربی ممالک یہ سوچنے کو تیار نہ تھے کہ ایک غریب اور پسماندہ ملک پاکستان ان کی اجارہ داری کو اتنی مختصر سی مدت کے اندر ختم کر کے رکھ دے گا چنانچہ جونہی انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ پاکستان نے ان کے خوابوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیا ہے وہ بھوکے گیدڑوں کی طرح پاکستان پر پل پڑے اور ہر قسم کے جھوٹ اور الزامات کا سلسلہ شروع کر دیا، وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ایک مسلم ملک اس شعبے میں ان کی ہمسری کا دعویدار بن جائے؟ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ہمیشہ اپنی اس تصویر کو شدت سے ناپسند کیا ہے جس میں مغرب نے ایک ایسے ''شیطانی ماسٹر مائنڈ'' کے رنگ بھر رکھے ہیں جو دنیا کو تباہی اور بربادی کی دہلیز تک لے جانے کے لیے تلا ہوا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ میں کوئی مخبوط الحواس پاگل شخص نہیں ہوں، یہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے اور مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور ہر قسم کا جھوٹ سچ مجھ پر تھوپتے رہتے ہیں کیونکہ میں نے ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا ہے جس کے نتیجے میں دنیا کے اس خطے میں طاقت کا توازن اور بلیک میلنگ کے امکانات بکھر کر رہ گئے ہیں چناں چہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے پاکستان کو دنیائے اسلام کے ایک مرکز کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا کیونکہ اب ان کا ملک ایک ایٹمی طاقت بن چکا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نزدیک پاکستانی ایٹم بم کی حیثیت ایک اسلامی بم کی سی تھی جسے تیار تو پاکستان نے کیا تھا لیکن جو پوری مسلم دنیا کے سائنسی کمالات کی ایک علامت بھی بن چکا تھا ان کے خیال میں بقیہ تمام اسلامی دنیا کو اس ایٹمی چھتری کے سائے تلے بچایا جا سکتا ہے جو انھوں نے پاکستان کو فراہم کر دی ہے اور اب اسے مزید آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ دنیائے اسلام کو دوسرے تمام ممالک اور اقوام کی نسبت سربلند دیکھنے کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستان کو مسلم دنیا میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہو جائے۔ ان اثرات کا اظہار زاہد ملک نے کیا ہے جو ڈاکٹر عبدالقدیر

خان کے سوانح نگار ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں ان کے بیش تر احباب اسی نقطۂ نظر پر زور دیتے ہیں کہ کیونکہ اس طرح اسلامی دنیا میں ان کا مقام بلند تر ہوتا ہے اور یہ بات بھی غیر اہم ہو جاتی ہے کہ وہ کسی لالچ، مالی مفاد یا فائدے کے لیے یہ کام کر رہے تھے چنانچہ ان کے سوانح نگار زاہد ملک کا کہنا ہے کہ میں نے خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اشک بار دیکھا ہے جب وہ یہ دل دوز مناظر دیکھا کرتے تھے کہ کس طرح اسرائیلی افواج بے بس اور نہتے فلسطینی مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنی سفاکانہ اور وحشیانہ جارحیت کا نشانہ بنا رہے ہیں، درحقیقت ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھ کر ان کے جذبات غیر معمولی طور پر مجروح ہو جایا کرتے تھے، وہ یہ بھی سوچا کرتے تھے کہ اگر مصر، لبنان، شام، سعودی عرب، عراق اور ایران کے پاس بھی ایٹمی صلاحیت موجود ہوتی تو اسرائیل کی جرأت نہیں تھی کہ وہ فلسطینیوں کو اپنے ظلم اور جارحیت کا نشانہ بنا سکے لیکن یہاں یہ عجیب و غریب سوال بھی جنم لیتا ہے کہ اگر وہ فی الواقعی ایک مسلم قوم پرست تھے اور مسلمان ممالک کو دنیا میں سرخرو دیکھنا چاہتے تھے تو انھوں نے شمالی کوریا کی مدد کیوں کی جو کہ ایک مسلمان ملک نہیں ہے؟ نہ ہی اس کے پاس بہت زیادہ پیسہ ہی دینے کو تھا؟ لہٰذا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے تمام محرکات بڑے پیچیدہ نوعیت کے تھے جن میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں لیکن ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ ان تمام عشروں اور سودوں کے درمیان ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود ایک چیز جو بڑی مستقل اور تواتر کے ساتھ دکھائی دیتی ہے وہ ہے ان کی انانیت اور اس کی قوت جس میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان: بلین ڈالر پروگرام کی کلیدی شخصیت

ہالینڈ کے ایک متوسط نوعیت کے انجینئر کی حیثیت سے ترقی کر کے ڈاکٹر عبدالقدیر

خان ایک بلین ڈالر پروگرام کی مرکزی شخصیت کا درجہ حاصل کر چکے تھے اور انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے وہ تمام تر مراعات، سہولتیں، آسانیاں اور پردہ داری میسر تھی جو ایسے کاموں کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ انھیں جو کنٹرول اور اختیارات حاصل تھے ان کی ماضی میں کوئی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس قوت و اختیار نے نہ صرف ان کی انا پرستی کی تسکین کا سامان فراہم کیا بلکہ ان کے بینک بیلنس میں بھی نمایاں اضافہ ہوتا چلا گیا جس کے نتیجے میں ایک محب وطن قوم پرست سائنسدان ایک ایسی ہستی میں تبدیل ہو گیا جے اختیارات، طاقت، پیسے اور اس شان و شوکت سے لطف اندوز ہونے کے مواقع میسر آتے گئے جو اس کے انوکھے اور منفرد کردار سے وابستہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی بدعنوانیوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی طاقت اور ان کے مقام نے انھیں بدعنوان بنانے میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ ان کے احباب کا کہنا ہے کہ حکومت پاکستان اور پاکستانی معاشرے نے انھیں جو اعلیٰ ترین مقام اور حیثیت دی تھی اس نے بالخصوص ۱۹۹۰ء کے بعد سے انھیں بدعنوانیوں کی جانب راغب کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ جب وہ کسی کمرے میں داخل ہوا کرتے تھے تو ان کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ وہاں موجود ہر شخص ان کے احترام میں اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ اپنی شہرت اور مقام کے بارے میں بھی وہ غیر معمولی طور پر حساس واقع ہوئے تھے اور بالعموم مغربی صحافیوں اور اخبارات کو خط لکھ کر اپنے خلاف شائع شدہ خبروں کے حوالے سے سخت احتجاج بھی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پاکستانی صحافیوں کو بھی خاصی بڑی اور بھاری رقومات دیں تاکہ وہ ان کی حمایت میں مضامین اور خبریں شائع کرتے رہیں۔ وہ بظاہر تو بڑی عاجزی، انکساری اور خاکساری کا تاثر دیتے لیکن بسا اوقات انٹرویو لینے والوں سے خاصی شیخیاں بھی بگھارتے رہتے تھے۔ اکثر کہا کرتے کہ ''وہ کسی سڑک کے کنارے کار سے اتر کر چائے بھی نہیں پی سکتے

کیوں کہ وہاں موجود دوسرے لوگ اس کی ادائیگی اپنی جیب سے کر دیا کرتے تھے۔ لوگ اپنی محبت اور احترام کا اظہار کرتے ہوئے بعض اوقات عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بڑی تسکین حاصل ہوتی ہے۔'' انھوں نے مزید بتایا کہ ''ایک دفعہ میں کسی ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج سے گزر رہا تھا، سیکیورٹی گارڈ میرے نزدیک آیا اور پوچھنے لگا کہ ''آپ کا وی آئی پی لاؤنج کارڈ کہاں ہے؟'' میں قطعی پریشان نہیں ہوا نہ چیخا چلایا، نہ ہی اپنے ہاتھ بلند کر کے اس سے یہ کہا کہ تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہوں! میں نے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ اس کے برعکس میں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی جیب سے کارڈ نکالا اور اسے دکھا دیا۔ وہ آدمی اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا، چناں چہ میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا حالاں کہ اس کے سپروائزر نے اسے کافی برا بھلا بھی کہا اور بولا تم نہیں جانتے یہ کون ہیں؟ ان کا نام ہے ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔''

پاکستانی حکومت اور سول سوسائٹی کی جانب سے انھیں جو مقام، حیثیت اور شان و شوکت حاصل ہوئی تھی وہ ان کی انانیت کے لیے خاصی اطمینان بخش تھی جس سے وہ بے حد محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ان کے نام سے ایک کرکٹ ٹیم بھی قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بعض اسکولوں اور اداروں کا نام بھی ان کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ۱۹۹۸ء میں کیے گئے بم دھماکوں کی یادگار کے طور پر شائع ہونے والے ڈاک کے ٹکٹ پر ان کی تصویر بھی چھاپی گئی تھی جو ان کے لیے قوم کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اکثر و بیشتر یہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ ان کا سلسلہ نسب تیرہویں صدی کے مسلمان فاتح شہاب الدین غوری سے ملتا ہے چناں چہ اُنھوں نے جو میزائل تیار کیا اس کا نام ''غوری'' اسی لیے رکھا تھا، جس کی یادگار قائم کرنے کی غرض سے اُنھوں نے کافی بڑی رقم خرچ کی تھی۔ یہ اطلاعات بھی عام تھیں کہ وہ پاکستان کے کسی شہر کو اپنے نام سے موسوم کرنے

کے خواہش مند بھی تھے۔ ٹیلی وژن کو ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا "پاکستانی ایٹم بم کا خالق کون ہے؟ اس کا خالق میں ہوں، یہ میزائل کس نے بنائے؟ انھیں میں نے بنایا ہے۔" اپنی شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچنے کے بعد وہ خود کو قطعاً ناقابل تسخیر تصور کرنے لگے تھے، چناں چہ انھوں نے ایسی حرکات شروع کردیں جنھیں پاگل پن کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ طاقت اور قوت کی نمود و نمائش، اختیارات کا بے جا استعمال اور پاکستانی ایٹم بم کے خالق ہونے کے احساس نے انھیں یہ یقین دلادیا تھا کہ کوئی چیز ان کے لیے ناممکن نہیں اور وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق جو چاہیں کرنے میں آزاد ہیں، کوئی انھیں روک نہیں سکتا۔

پاکستان میں ان کی زندگی کے علاوہ پوری دنیا میں جوہری ٹیکنالوجی کے ایک کامیاب سیلز مین کی حیثیت سے ان کی حرکات و سکنات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر مختارِ کل سمجھ بیٹھے تھے۔ اس کی مثال اس واقعے سے دی جاسکتی ہے کہ جب انھوں نے راولپنڈی شہر میں راول جھیل کے کنارے مکان تعمیر کراتے ہوئے مقامی بلڈنگ پلاننگ کے قوانین کا قطعاً کوئی لحاظ یا خیال نہیں کیا۔ ان کے شاندار محل نما مکان سے نکلنے والی "بدرو" کا پانی اس جھیل میں جاکر گرتا تھا جس کا پانی ایک آدمی پینے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ یہ ایک نمایاں علامت تھی اس بات کی کہ وہ خود کو تمام اصولوں اور قوانین سے ماورا تصور کرتے تھے۔ جب بلڈوزر کی مدد سے ان کا یہ مکان منہدم کیا جانے لگا جس کے احکام مقامی حکام نے جاری کیے تھے تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے باڈی گارڈز نے بلڈوزر کے ڈرائیور کو گولی ماردی اور ان کے مکان کو منہدم نہیں کرنے دیا گیا۔ ڈاکٹر خان بھی اپنی کار اور گھر دونوں میں اپنی سلامتی کے لیے اسلحہ رکھا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈز بھی رکھے ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں ایک اور واقعے کی تفصیلات بھی سن لیجیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے

اختیارات اور طاقت کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے کس حد تک جاسکتے تھے۔ ہوا یوں کہ ۱۰ دسمبر ۲۰۰۲ء کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے خان ریسرچ لیبارٹریز سے اپنے ساتھیوں کے علاوہ کچھ مسلح افراد کو بھی طلب کیا اور کراچی میں واقع ایک ایسی بلڈنگ کا رُخ کیا جو کسی رفاہی پلاٹ پر تعمیر کی گئی تھی جہاں "انسٹی ٹیوٹ آف بیہیویرل سائنسز" قائم تھا۔ اس وقت وہاں کافی مصروفیت اور بھاگم بھاگ کا ماحول تھا اور چالیس کے قریب ذہنی امراض میں مبتلا مریض اپنی اپنی باری کے منتظر تھے تاکہ ڈاکٹروں سے معائنہ کراسکیں۔ عدالتی دستاویزات کے مطابق ڈاکٹر خان کے ہمراہ آنے والے افراد نے وہاں موجود سیکیورٹی گارڈز کو دھکے دے کر ایک طرف کردیا اور اپنی اپنی پوزیشنیں اس طرح سنبھال لیں جیسے دورانِ جنگ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خان نے مذکورہ انسٹی ٹیوٹ کے حکام کو طلب کرکے بتایا کہ وہ فوری طور پر یہ عمارت خالی کردیں کیوں کہ اس عمارت کی تمام انتظامیہ تبدیل ہوچکی ہے اور اب یہ عمارت ان کی تحویل میں نہیں ہے۔ معاملہ عدالت تک جا پہنچا جہاں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے وکلاء نے ان کی اعلیٰ حیثیت اور بلند مقام کے تناظر میں ان کا دفاع کرتے ہوئے درج ذیل بیان داخل کیا:

"مدعی کی حیثیت قومی ہیرو کی سی ہے انھوں نے تن تنہا پاکستان کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فراہم کرنے کے لیے شبانہ روز محنت کی ہے، چناں چہ یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدعی کو اس معاشرے میں ایک باعزت اور قابلِ اعتبار مقام و مرتبہ حاصل ہے جس کا وہ بجا طور پر مستحق بھی ہے۔"

پاکستان کے کرپٹ اور بدعنوان معاشرے تک میں جہاں عمائدین اور اشرافیہ کے لوگ دن رات پیسا بنانے میں مشغول رہتے ہیں ڈاکٹر خان کی دولت کے انبار لگانے کی ان کوششوں کو بری نظر سے دیکھا گیا۔ ایک صحافی کے بقول یہ ذلت اور پستی کی انتہا تھی وہ جو چاہے کرسکتے تھے انھیں روکنے والا کون تھا؟

لالچ، طاقت، اختیارات، مسابقت، قوم پرستی، احساسِ محرومی اور احساسِ تفاخر تمام تر مل کر انھیں ایک ایسے مقام پر لے آئے تھے جہاں ان کی بلند خواہشات اور کسی بھی بات کو اہمیت نہ دینے کے رجحان نے انھیں اتنے بلند مقام سے اچانک نیچے گرا دیا تھا۔

ڈاکٹر قدیر خان نیٹ ورک کا زوال

برطانوی صحافی گورڈن ایرا کی کتاب "Shopping for the bombs" درحقیقت دو بنیادی حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نیٹ ورک کے عروج پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی جانب سے جوہری ٹیکنالوجی کے تبادلے اور اس کی فروخت کے حوالے سے ایران، شمالی کوریا اور لیبیا کے علاوہ دیگر انفرادی سودوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے نیٹ ورک کے عروج کا زمانہ قرار دیا ہے۔ مصنف نے نیٹ ورک کے عروج کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے مقتدر حلقوں، عوام اور دیگر ممالک میں ان کی بے پناہ شہرت، عزت، مقام اور مرتبے کا ذکر کیا ہے۔ مصنف کے بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پاکستان کے علاوہ دیگر عرب اور مسلم ممالک میں ایک قومی اور اسلامی ہیرو کا درجہ حاصل تھا۔ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ پاکستانی ایٹم بم کے خالق ہونے کے ناطے ڈاکٹر خان تمام پابندیوں سے مستثنیٰ تھے اور ان پر کسی بھی قسم کی کوئی قدغن نہیں تھی۔ وہ ہر ایک اصول، قانون اور ضابطے سے ماورا تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے عروج کے زمانے میں امریکی سراغ رساں ادارے سی آئی اے کو ان کی سرگرمیوں کے بارے میں شدید نوعیت کے خدشات لاحق تھے اور متعدد اطلاعات اسے مل چکی تھیں لیکن بعض ناگزیر وجوہ اور سیاسی مصلحتوں کے سبب انھوں نے اس نیٹ ورک کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا ہی مناسب جانا۔ مصنف نے کتاب کے پہلے حصے میں مذکورہ نیٹ ورک کے عروج کا تذکرہ کرنے سے قبل یہ بھی لکھا ہے کہ

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نہایت حساس اور جذباتی قسم کے محبِ وطن قوم پرست پاکستانی تھے جو سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ گئے تھے لیکن ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے ایک بازو کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام نے ان کے تمام سابقہ تصورات، خیالات اور نظریات کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دل دوز مناظر انھوں نے بچشم خود ٹیلی وژن پر دیکھے تھے۔ اس زمانے میں وہ بیلجیئم میں تھے۔ پاکستانی افواج کے کمانڈر کی جانب سے ہتھیار ڈالنے اور مشرقی پاکستان کے سقوط نے ان کے دل اور ذہن کو گویا بری طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا، چنانچہ انھوں نے اس لمحہ موجود میں ایک بہت بڑا فیصلہ کر ڈالا۔ انھوں نے اس بات کا پختہ عزم اور مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ پاکستان کو ایک ایسی مضبوط اور طاقتور ریاست میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کریں گے جس کے نتیجے میں کسی طاقت بالخصوص بھارت کو کبھی یہ ہمت نہ ہوگی کہ وہ اسے میلی نظروں سے دیکھ سکے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہر قیمت پر پاکستان کو ایک ایٹمی طاقت بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ سقوط ڈھاکہ مشرقی پاکستان کے زوال اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد یورپ میں ان کی زندگی کا ہر ایک لمحہ بس اسی ایک مقصد کے لیے وقف ہو چکا تھا جس میں آخر کار انھوں نے کامیابی حاصل کر ہی لی اور پاکستان کو ایٹم بم بنا کر دے دیا۔ اس طرح انھوں نے پاکستان کو یعنی اپنے پیارے وطن کو ایٹمی کلب کا رکن بنا دیا۔ یہاں سے اس کہانی کا دوسرا موڑ شروع ہوتا ہے جس کا بیشتر حصہ آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اب اسی کہانی کا ایک اور اہم موڑ آپ کی نگاہ سے گزرے گا جو درحقیقت ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے جوہری نیٹ ورک کے زوال کی داستان ہے۔ جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ امریکی حکومت اور سی آئی اے نے بعض ناگزیر سیاسی مصلحتوں کی بناء پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے سلسلے میں حکومت پاکستان سے باز پرس ضروری نہیں سمجھی کیونکہ اس طرح دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں پاکستان کا فعال کردار غیر معمولی طور پر متاثر

ہوسکتا تھا کیونکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اپنی قوم اور ملک میں ایک ''دیوتا'' اور ''ہیرو'' کا درجہ حاصل تھا۔ ان کے خلاف کوئی سخت اقدام امریکا کے عزائم کا ساتھ دینے والی پاکستانی حکومت کے زوال میں اہم کردار ادا کرسکتا تھا۔ جب امریکی حکومت کو پوری طرح اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ اب ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک پر ہاتھ ڈالنے کا مناسب وقت آن پہنچا ہے تو اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر پاکستانی حکومت کو ایسے تمام شواہد مہیا کردیے جن کے نتیجے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پوری قوم کے روبرو ٹیلی وژن پر آکر اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگنا پڑی اور اس طرح ان کے نیٹ ورک کا یہ زوال اپنے اختتام کو پہنچا۔ اب آپ اس کہانی کا یہ اہم ترین باب پڑھیے اور نتائج خود ہی اخذ کیجیے کہ ایسا کیوں ہوا۔ عروج کی کہانی آپ نے قسط وار پڑھ لی اب زوال کی داستان بھی ملاحظہ فرمائیں۔

واشنگٹن ڈی سی تمبر ۲۰۰۱ء: پاکستان کی انتہائی طاقتور ''انٹر سروسز انٹیلی جنس'' آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل محمود چند دن پیش تر ہی واشنگٹن پہنچے تھے۔ وہ اور ان کی اہلیہ امریکن سی آئی اے کے اس طیارے پر سوار ہوکر یہاں پہنچے تھے جو غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہوں کو دورۂ امریکا کے موقع پر فراہم کیا جاتا ہے لیکن جڑواں ٹاوروں اور پینٹا گون پر حملوں کے بعد اچانک ان کے اس دورے کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا اور اس نے ایک نہایت سنجیدہ پہلو اختیار کرلیا تھا۔ یہ بات تو فوری طور پر صاف اور واضح ہوچلی تھی کہ ہمسایہ ملک افغانستان میں اسامہ بن لادن سے نمٹنے کے لیے امریکا کو پاکستان کی مدد درکار ہوگی۔ جنرل محمود احمد سے کہا گیا کہ وہ دوسرے دن صبح پاکستانی سفیر ملیحہ لودھی کو لے کر باکسر نما چوڑے چکلے سینے والے نائب امریکی وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج سے ملیں۔ رچرڈ آرمیٹج سیدھی اور صاف صاف گفتگو کرنے والے سابق فوجی ہیں جو کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے اور دل کی بات زبان پر لے آتے ہیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب رچرڈ آرمیٹج پینٹا گون سے وابستہ تھے تو افغانستان میں سوویت روس کے خلاف مجاہدین کی تحریک پر نظر رکھنے کی خاطر وہ اکثر پاکستان کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ اسی وقت سے وہ پاکستان کے لیے دوستانہ جذبات رکھتے تھے لیکن اب ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کے ان حملوں کے بعد رچرڈ آرمیٹج اور ان کے باس امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ پاکستان کے حکام سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کریں گے۔ آرمیٹج نے جنرل محمود احمد سے بات چیت کے دوران پاکستانی حکومت کو ایک نہایت سخت پیغام ارسال کیا۔ یہ پیغام اتنا سخت تھا کہ جنرل محمود احمد کو کہنا پڑا کہ آرمیٹج کا لب ولہجہ انتہائی تلخ اور گستاخانہ تھا۔ آرمیٹج نے اپنے کمرے میں رکھے ایک ڈیکوریشن پیس کی جانب اشارہ کیا جو انھیں حکومت پاکستان نے تحفے میں دیا تھا اور بولے ''اگر اسلام آباد ابھی اور اسی وقت ہماری مدد نہیں کرتا تو وہ یہ تحفہ پاکستانی حکومت کو واپس کردیں گے جس کے بعد کوئی بھی امریکی پاکستان سے آئندہ اس قسم کا تحفہ قبول نہیں کرے گا۔'' اپنی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وہ گویا ہوئے ''امریکی حکومت کی خواہش ہے کہ طالبان کا اقتدار ختم کردیا جائے تاکہ اسامہ بن لادن پر ہاتھ ڈالا جاسکے، چنانچہ اب پاکستان کے پاس کوئی اور متبادل نہیں سوائے اس کے کہ وہ طالبان یا امریکا دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔'' انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا: ''یا تو آپ سو فیصدی ہمارے ساتھ رہیں یا پھر سو فیصدی ہمارے خلاف بیچ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' جنرل محمود احمد ہکا بکا رہ گئے۔ ایسا شخص جو کبھی پاکستان کا دوست تھا اب اس نے اپنی آنکھیں پھیر لی تھیں اور انتہائی سرد مہری کے ساتھ باتیں کررہا تھا۔ بہرکیف جنرل محمود احمد نے احتجاج کرنے کے انداز میں ان سے کہا کہ ''واشنگٹن کو طالبان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ۱۹۹۰ء کے وسط سے پاکستانی حکومت اور خاص طور سے آئی ایس آئی طالبان کی پرورش

کرری ہے اور انھیں پاکستان کی کھلم کھلا سرپرستی حاصل رہی ہے۔" خود جنرل محمود احمد طالبان کے ساتھ آئی ایس آئی کے گہرے روابط اور تعلقات کے بہت بڑے حامی رہے تھے۔ "بہرصورت تاریخ ماضی کا حصہ ہوتی ہے جب کہ مستقبل کا آغاز آج یعنی حال سے ہوتا ہے۔" آرمیٹج نے جواب دیا اور جنرل محمود احمد سے دوسرے دن پھر آنے کے لیے کہا۔ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول اور ان کے نائب رچرڈ آرمیٹج نے وہ پوری دوپہر سات مطالبات پر مشتمل ایک فہرست کی تیاری میں صرف کردی جو جنرل محمود احمد کو دوسرے دن دے دی گئی۔ انھیں بتایا گیا کہ "یہ ایک فہرست ہے، اسے کھانوں کی فہرست نہ سمجھا جائے، ہمیں امید ہے کہ جنرل مشرف ہمارے ان مطالبات کا جواب فوری طور پر دیں گے۔" آپ ہمارے ساتھ ہیں یا آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں، درمیانی راستہ کوئی نہیں ہے۔ بہرصورت امریکی وزیر خارجہ کی جانب سے سات مطالبات کی جو فہرست جنرل محمود احمد کو فراہم کی گئی تھی ان میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا نام شامل نہیں تھا۔ اب دہشت گردی کو بقیہ تمام مسائل اور موضوعات پر ترجیحی اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔

جنرل محمود احمد نے صدر جنرل پرویز مشرف کو ٹیلی فون پر پوری صورت حال سے تفصیلی طور پر آگاہ کردیا جس کے بعد جنرل مشرف نے حتمی اور آخری فیصلے کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ اسی دن دوپہر کو تین بجے کے قریب ہونے والی ایک دوسری ملاقات میں رچرڈ آرمیٹج کو ان کے سوال کا جواب مل چکا تھا جس کے بعد انھوں نے طالبان کو اقتدار سے بے دخل کرنے اور القاعدہ سے نمٹنے کی خاطر لاجسٹک اور انٹیلی جنس کی سہولتیں فراہم کرنے کا مطالبہ کردیا۔ گذشتہ کئی سالوں سے پاکستان کے مقتدر سیاسی حلقوں میں اس بات پر بحث جاری تھی کہ ہمیں طالبان کی حمایت کی ایک دن بڑی بھاری قیمت ادا کرنا ہوگی تاہم پاکستانی فوج بشمول جنرل پرویز مشرف اس بات کے بڑے پرزور حامی تھے کہ پاکستان کو افغانستان کی شکل میں ایک ایسی طفیلی ریاست میسر آجائے گی

جو اسے بھارت کے خلاف اسٹریٹجک گہرائی فراہم کرسکے گی لیکن اب تو ہر چیز تبدیل ہو چکی تھی۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی برسوں پرانی پالیسی کو فوری طور پر ترک کرتے ہوئے اس سے دامن چھڑالیا۔ "نائن الیون کا سانحہ گویا" بجلی گرنے کے مترادف تھا۔" صدر جنرل پرویز مشرف نے ذکر کرتے ہوئے کہا "مجھے اس وقت جو سنگین چیلنج درپیش تھے انھیں میں نے ایک طرف رکھا کیوں کہ امریکی حکومت کا ساتھ دینے میں مجھے بے شمار فائدے اور امکانات نظر آرہے تھے، چنانچہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے ان امکانات کے راستے پر ہی چلنا ہوگا۔" اپنے اس فیصلے کو درست ثابت کرنے کی غرض سے مجھے بیرونی دباؤ برداشت کرنے کے علاوہ داخلی سطح پر بھی رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ ۱۹۹۹ء کے فوجی انقلاب کے بعد صدر جنرل پرویز مشرف کے تعلقات امریکی حکومت سے کشیدہ ہوگئے تھے اور اس نے سردمہری کا رویہ اختیار کررکھا تھا، چنانچہ مشرف کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ اس مرحلے پر امریکی حکومت کا ساتھ دینے کے عوض انھیں امریکا کے ساتھ اپنے تعلقات کو بحال کرنے کا ایک بہترین موقع میسر آسکتا ہے لہٰذا نائن الیون کے واقعات اور القاعدہ کے خلاف امریکی مہم کے نتیجے میں ایک بار پھر ۱۹۸۰ء کی دہائی جیسے حالات پیدا ہو چکے تھے جب پاکستان پر جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے دوران افغانستان کے حوالے سے پاکستان اور امریکا کے مابین بہترین شراکت قائم ہو چکی تھی اور امریکی حکومت نے پاکستان پر عائد شدہ پابندیوں کا خاتمہ کرکے ڈالروں اور ہتھیاروں کے انبار لگادیے تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان کو یہ موقع بھی مل چکا تھا کہ وہ سفارتی آڑ میں اپنی دوسری اسٹرٹیجک کارروائیوں کو بھی جاری رکھ سکے۔ صدر جنرل پرویز مشرف ایک سپاہی کی قوت فیصلہ رکھتے ہیں لہٰذا انھوں نے تمام امکانات، مواقع اور حاصل ہونے والے فائدوں کا بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیا۔ اسٹریٹجک نقطہ نظر سے امریکا کا ساتھ دینے کی

صورت میں حاصل ہونے والے ثمرات کو پیش نظر رکھا اور امریکا کے ساتھ کھڑے ہونے کا تاریخی فیصلہ کرلیا خواہ اس کے لیے طالبان کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ اس طرح صدر جنرل پرویز مشرف پاکستان کے دیگر دو کلیدی اہمیت کے قومی مفادات کو بچانے اور محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوگئے تھے جن میں سے ایک کا تعلق پاکستان کے جوہری ہتھیاروں اور دوسرے کا تعلق مسئلہ کشمیر سے ہے۔ بہرنوع آگے چل کر حالات اور واقعات نے یہ ثابت کردکھایا کہ امریکا کا ساتھ دینے کا اعلان کرکے دراصل جنرل پرویز مشرف نے چال بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ۱۴ رستمبر ۲۰۰۱ء کو انھوں نے اپنے سینئر فوجی کمانڈروں سے ملاقات کی اور انھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ چھ گھنٹوں تک ان کے اس فیصلے پر بڑی گرما گرم بحث جاری رہی بہرطور چار جنرلوں نے ان کی اس تجویز اور فیصلے سے اتفاق نہیں کیا جن میں ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل عثمانی اور جنرل محمود احمد بھی شامل تھے۔ جنرل محمود احمد نے جنرل پرویز مشرف کو برسراقتدار لانے میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا تھا لیکن اب وہ انتہائی مذہبی اور امریکا کے مخالف ہوچکے تھے، چنانچہ اس اختلاف رائے کے فوراً بعد جنرل مشرف نے چن چن کر ان جنرلوں کو فارغ کردیا جو امریکی حکومت کا ساتھ دینے کی مخالفت کررہے تھے۔ انھوں نے جنرل عثمانی اور جنرل محمود احمد کو برطرف کردیا جس کے بعد آئی ایس آئی کی سینئر لیڈر شپ میں بعض نہایت اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ اب پاکستان کی یہ انتہائی طاقتور تنظیم آئی ایس آئی ان کے مکمل کنٹرول میں تھی اور وہ جو چاہے کرسکتے تھے۔ چند ہفتوں کے اندر اندر جوہری مسئلے اور مشرف کی فوجی بغاوت کے حوالے سے عائد کردہ پابندیاں اٹھالی گئیں۔ آئندہ تین برسوں کے دوران پاکستان کو ۶۴ء۲ بلین ڈالر کی امریکی امداد بھی مل گئی۔ ایک بار پھر پاکستان اور امریکا کے تعلقات ایک بڑی تبدیلی سے ہمکنار ہوچکے تھے۔ بہرحال نائن الیون کے واقعات نے اس سوال پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے تھے کہ ڈاکٹر

عبدالقدیر خان کا کیا کیا جائے؟؟ اب یہ تشویش پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی کہ جوہری پھیلاؤ کے مسئلے کو فوری طور پر کیسے نمٹایا جائے کیونکہ اب یہ خطرہ لاحق ہوچکا تھا کہ القاعدہ بھی جوہری ہتھیاروں پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ساتھ معاملات کو طے کرنا بھی خاصا دشوار اور پیچیدہ تھا۔ امریکا کی نائن الیون کے حملوں کے نتیجے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سرگرمیوں کے بارے میں لاحق تشویش ماضی کی نسبت کئی گنا بڑھ چکی تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اب یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ انھیں روکنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

نگہہ داری

کہوٹہ کے ابتدائی دنوں سے ہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان غیرملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی توجہ کے حوالے سے کافی محتاط اور حساس رویوں کا اظہار کرتے رہے تھے۔ وہ خود بھی نیدرلینڈ میں یورینکو سے وابستگی کے زمانے میں نہ صرف ایک جاسوس کا کردار ادا کرچکے تھے بلکہ ایٹمی راز بھی سرقہ کیے تھے لہٰذا انھیں اس بات کا شدت کے ساتھ احساس تھا کہ ان پر نگاہ رکھی جاسکتی ہے اور انھیں انٹیلی جنس ایجنسیاں اپنا ہدف بناسکتی ہیں۔ اس ضمن میں وہ خاص طور سے برطانوی انٹیلی جنس سے کافی محتاط رہا کرتے تھے بلکہ انھوں نے اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی گھڑ رکھا تھا کہ برطانوی انٹیلی جنس سروس M-16 نے ان کے آدمیوں اور اسٹاف کو اس قدر وافر رقم فراہم ہی نہیں کی کہ وہ انھیں خفیہ معلومات اور اطلاعات بہم پہنچاتے۔ حالانکہ ایک برطانوی ایجنسی الیکٹرانک ذرائع سے ڈاکٹر خان کی جاسوسی میں مصروف تھی اور امریکی قومی سیکیورٹی ایجنسی بھی ان پر نظر رکھے ہوئے تھی تاہم انھیں کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوسکی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر خان حد درجہ محتاط اور ہوشیار رہا کرتے تھے۔ انٹیلی جنس افسران نے بارہا اس بات کی کوشش کی کہ ڈاکٹر خان اور ان کے سینئر اسٹاف کے نزدیک آسکیں لیکن اس میں بھی انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا

پڑا۔ کہوٹہ میں داخل ہونا ناممکن تھا۔ جب بھی کسی فرد کو کہوٹہ سے باہر کسی سیمینار یا کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جانا ہوتا تو سیکیورٹی کے افراد ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے تاکہ کوئی انٹیلی جنس ایجنسی ان تک نہ پہنچ سکے لیکن رفتہ رفتہ کامیابی اور اعتماد کے نشے میں چور ڈاکٹر خان اور ان کے قریبی ساتھی بالآخر غفلت اور لاپروائی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ وہ گذشتہ کئی عشروں سے اس کام میں مصروف تھے لہٰذا انھوں نے یہ سوچ کر انتہائی محتاط رویوں کو ترک کر دیا تھا کہ اب کوئی بھی ان کی جاسوسی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

امریکی سی آئی اے اور برطانوی ایجنسی M-16 کے خدشات

۱۹۹۰ء کی بقیہ دہائی کے دوران امریکی سی آئی اے اور برطانوی ایجنسی M-16 کو یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کسی نہ کسی پراسرار نوعیت کے کام میں مصروف ہیں تاہم ان کی سرگرمیوں کی اصل نوعیت اور ماہیت ابھی تک غیر واضح تھی۔ چنانچہ ان دونوں ایجنسیوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر قیمت پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک پر گہری اور کڑی نگاہ رکھیں گے تاکہ اصل حقائق تک پہنچا جا سکے۔ یہ ایک امریکی برطانوی مشترکہ منصوبہ تھا جس کے تحت دونوں ممالک اس بات کے پابند تھے کہ وہ تمام تر اطلاعات اور معلومات کا تبادلہ کریں گے جو انتہائی حساس نوعیت کی ہوں گی اور جنھیں ایک مخصوص اور محدود ٹیم تک ہی رکھا جائے گا۔ اس حوالے سے اس قدر احتیاط کے ساتھ کام کیا جا رہا تھا کہ عبدالقدیر خان نیٹ ورک اور لیبیا کے بارے میں امریکی سی آئی اے کے اہم ترین حلقوں نے امریکا کے سب سے بڑے اتحادی اور حلیف ملک اسرائیل کی ایجنسیوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا تھا۔

جنوری ۲۰۰۱ء: امریکی حالت کی تبدیلی اور بش انتظامیہ کا قیام

سابق امریکی صدر بل کلنٹن کی حکومت کے آخری برس کے دوران امریکی انٹیلی جنس اداروں تک یہ اطلاعات پہنچ چکی تھیں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور لیبیا کی حکومت

کے مابین سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کے شعبے میں تعاون کا سلسلہ جاری ہے۔ یورپ اور دبئی سے بھی انھیں متواتر اس بارے میں اطلاعات موصول ہو رہی تھیں تاہم اس زمانے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نیٹ ورک کی مکمل سمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا، چناں چہ سی آئی اے کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس پورے نیٹ ورک کی کارکردگی اور سرگرمیوں پر بھرپور طریقے سے نظر رکھے۔

جنوری ۲۰۰۱ء میں موجودہ امریکی صدر جارج واکر بش نے امریکا کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ نے سینئر امریکی افسران کے ایک مختصر گروپ کو عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دی۔ اس مختصر گروپ میں اعلیٰ سطح کے امریکی حکام اور ان کے نائبین شامل تھے جنھیں اہم ترین نوعیت کے فیصلے کرنے کا مکمل اختیار حاصل تھا۔ اس میں شامل کلیدی شخصیات میں ڈپٹی سیکرٹری آف اسٹیٹ رچرڈ آرمیٹج، ڈپٹی نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر اسٹیفن ہیڈلی، سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر جان مکلافلن، سیکرٹری آف اسٹیٹ کولن پاول اور اسی قبیل کے دیگر اعلیٰ امریکی حکام شامل تھے۔ اس گروپ کو ڈاکٹر خان نیٹ ورک کے بارے میں جو تفصیلی بریفنگ دی گئی اسے ڈائریکٹر سی آئی اے کی ذاتی منظوری حاصل تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ انتظام بھی کیا گیا تھا کہ امریکی صدر اور برطانوی وزیر اعظم دونوں کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی تمام سرگرمیوں اور کارروائیوں سے مکمل طور پر باخبر رکھا جائے گا تاکہ وہ اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے ہوئے اس کی بابت کسی حتمی فیصلے تک پہنچ سکیں۔

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء: نیویارک اور واشنگٹن میں القاعدہ کے حملے

ابھی امریکی سی آئی اے کی جانب سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے بارے میں تحقیقات کے حوالے سے تبادلہ خیال اور بحث و مباحثہ جاری تھا کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو

نیویارک کے جڑواں ٹاور اور واشنگٹن میں امریکی محکمہ دفاع پینٹاگون کی عمارت پر دہشت گردوں کے حملوں کا واقعہ رونما ہو گیا جس کے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی سرگرمیوں اور جوہری ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ میں ان کے کردار کے حوالے سے انٹیلی جنس اداروں کی کارکردگی میں نمایاں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ امریکا پر دہشت گرد حملوں کے بعد یہ خوف بھی عام ہو چلا تھا کہ دنیا کی غنڈہ اور بدمعاش ریاستوں، دہشت گردوں اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا سراغ لگانے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ ان معاملات پر فوری توجہ دی جائے۔ امریکا پر دہشت گردوں کے حملوں کے بعد امریکا اس کا جواب دینے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

اس صورتحال کے تناظر میں پاکستان اور امریکا کے مابین تعلقات ایک بالکل ہی نئی سمت اور جہت اختیار کر چکے تھے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ صورت حال دسمبر ۱۹۷۹ء کے حالات سے بے حد مماثل تھی جب سوویت یونین نے افغانستان پر فوج کشی کی تھی۔ ایک بار پھر پاکستان کو امریکا کے اہم ترین حلیف اور اتحادی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کی طرح اب امریکی حکومت کو پاکستان کی ضرورت لاحق ہو چکی تھی تاکہ اس کے تعاون اور مدد کے ساتھ وہ دہشت گردی کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے افغانستان کے ایک نئے مسئلے سے بھی نمٹنے کی کوشش کرے جسے نائن الیون کے واقعات کے بعد انتہائی ترجیحی اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ سینئر امریکی حکام کے مطابق ان حالات کے سبب ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے خلاف کارروائی میں بھی قدرے تاخیر ہو گئی، تاہم یہ سلسلہ ختم ہونے کے بجائے بدستور جاری رہا لیکن اس میں درپیش حالات کے مدنظر تھوڑی سی ترمیم کرنا پڑی جس کا تعلق پاکستان کی جوہری صلاحیت سے تھا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے برعکس اس مرتبہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے معاملے میں کافی چھوٹ دے دی گئی تھی کیونکہ پاکستان اس وقت داخلی بحران اور بے چینی کا شکار تھا اور یہ

خطرہ ہر وقت سروں پر منڈلا رہا تھا کہ کہیں صدر جنرل پرویز مشرف کا تختہ نہ الٹ دیا جائے۔ یہ خطرہ پاکستان کی مسلح افواج کے ان عناصر کی جانب سے لاحق تھا جو طالبان اور القاعدہ کے لیے اپنے دلوں میں گہری ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے اور یہ خدشات بھی موجود تھے کہ کہیں پاکستان کے جوہری ہتھیار ان انتہا پسند عناصر کے ہاتھوں میں نہ چلے جائیں، چنانچہ اسی خدشہ اور خطرے کے پیش نظر امریکی انتظامیہ نے پاکستانی حکومت کو خبردار کیا تھا کہ وہ اپنے جوہری ہتھیاروں پر نگہ داری اور نگرانی کو انتہائی سخت کر دے لیکن دوسری جانب پاکستان کو یہ فکر لاحق تھی کہ جوہری ہتھیاروں کے محل وقوع اور نوعیت کے بارے میں امریکی انٹیلی جنس اداروں کو پتہ چل گیا تو ایسی صورت میں اسے اپنا جوہری پروگرام رول بیک کرنا پڑے گا یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ امریکا ان ہتھیاروں پر قبضہ کر لیتا تاہم حقیقت یہ ہے کہ امریکی حکومت نے پاکستان کے جوہری ہتھیاروں پر بڑی خاموشی کے ساتھ قبضہ کرنے کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا لیکن ہر قیمت پر یہ منصوبہ انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا۔

القاعدہ اور پاکستان کے جوہری ہتھیار

اسی کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ کہیں القاعدہ پاکستان کے جوہری ہتھیاروں پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ ۱۹۹۰ء کے اوائل ہی سے اسامہ بن لادن کو جوہری مواد کی تلاش اور جستجو رہی تھی۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے آس پاس القاعدہ کے ایک اہم رکن نے سوڈانی باشندے سے ایک اعشاریہ پانچ ملین ڈالروں کے عوض یورینیم حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے جو سلنڈر دیے گئے وہ بیکار ثابت ہوئے۔ بہرکیف ۱۹۹۸ء میں اسامہ بن لادن نے یہ اعلان کر دیا کہ غیر روایتی نوعیت کا جوہری اسلحہ حاصل کرنا بھی ان کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ بالعموم دہشت گرد افراد اور گروپ اس قابل نہیں ہوتے کہ فوائل مواد کی تخلیق کے لیے اپنا انفراسٹرکچر قائم کر سکیں۔ چنانچہ ان

ی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی ملک سے جوہری ہتھیار حاصل کر سکیں لہٰذا وہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ جوہری ہتھیار خرید لیں یا پھر انھیں سرقہ کر لیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ فزائل مواد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کی مدد سے ایک سادہ سا بم تیار کر سکیں۔ بہرنوع جوہری ہتھیاروں کو خریدنے یا پھر انھیں سرقہ کیے جانے کا خوف سب سے زیادہ سوویت یونین کی سابقہ ریاستوں اور پاکستان ہی سے وابستہ رہا ہے۔ ۲۰۰۱ء کے اواخر میں یہ امکان بہت واضح اور حقیقی نظر آ رہا تھا بلکہ امریکی سی آئی اے سے متعلقہ ایک ذریعے "ڈریگان فائر" کا تو یہ تک کہنا تھا کہ "القاعدہ نے ایسا جوہری ہتھیار حاصل بھی کر لیا تھا لیکن نیویارک میں اس کا سراغ لگا لیا گیا تھا۔ جنوبی ایشیاء کے خطے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات نے بڑھتی ہوئی بے چینی اور تشویش میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں جب امریکی فوجی دستے اور انٹیلی جنس کارپردازان کابل میں داخل ہوئے تو انھیں القاعدہ کے جوہری ہتھیاروں کے حصول کی خواہشات سے آگاہی ہوئی اور بہت سی نئی باتوں اور حقائق کا انکشاف ہوا جن میں پاکستان کے کردار کو نمایاں اہمیت حاصل تھی۔ افغانستان میں طالبان کی شکست کے بعد جو دستاویزات اور کاغذات ان کے اہم ٹھکانوں سے برآمد ہوئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی انٹیلی جنس اداروں نے القاعدہ کے عزائم کا ٹھیک طور سے اندازہ نہیں لگایا تھا۔ ان دستاویزات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ القاعدہ کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کے لیے بھی کوشاں تھی لیکن امریکی سی آئی اے کو ان حقائق کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔

پاکستانی جوہری سائنس دانوں کی القاعدہ سے ملاقات

درحقیقت جن دستاویزات نے صحیح معنوں میں چونکا دینے والے انکشافات کیے تھے ان کا تعلق اس اطلاع سے تھا کہ پاکستان کے جوہری سائنس دانوں نے کابل میں طالبان اور القاعدہ کے لیڈروں سے ملاقات کی تھی تاکہ جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے

پروگرام پر تبادلہ خیال کیا جا سکے۔ انھی جوہری سائنس دانوں میں سلطان بشیر الدین محمود بھی شامل تھے جنھوں نے ۱۹۷۲ء کے دوران ملتان میں ہونے والے ایک اجلاس میں ذوالفقار علی بھٹو کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ ان کے ہمراہ افغانستان جانے والے دوسرے سائنس دان چودھری عبدالمجید تھے جو ۲۰۰۰ء میں پاکستان کے جوہری پروگرام سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ ان دونوں جوہری سائنس دانوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے علیحدگی کے بعد "امہ تعمیر نو" کے نام سے ایک خیراتی ادارہ قائم کر لیا تھا جو افغانستان میں امدادی پروگرام کے تحت خدمات انجام دے رہا تھا۔ بشیر الدین محمود کی تمام تر ہمدردیاں طالبان کے ساتھ تھیں جن سے ہر ایک شخص واقف تھا، چنانچہ جب ۲۰۰۰ء میں وہ کابل گئے تو اسامہ بن لادن نے ان کی آمد کی خبر سن کر اپنے ایک بااعتماد آدمی کو ان کے ہوٹل بھیجا تھا تاکہ ان سے ملاقات کا اہتمام کیا جا سکے۔ اگست ۲۰۰۱ء کے دوران اسامہ بن لادن نے بشیر الدین محمود سے دوسری ملاقات کی جو کابل ہی میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں بشیر الدین محمود کے بیٹے کا کہنا ہے کہ "اسامہ بن لادن نے میرے والد سے دریافت کیا کہ ایٹم بم کس طرح بنایا جاتا ہے؟؟ کیا آپ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟؟ بشیر الدین محمود نے اسامہ بن لادن کو بتایا کہ "ایٹم بم بنانا بے حد مشکل اور دشوار کام ہے۔" بہرطور وہائٹ ہاؤس کے ذرائع کے مطابق بشیر الدین محمود کے ساتھ ایک اور ملاقات کے دوران اسامہ بن لادن کے ایک ساتھی نے انھیں بتایا کہ "اس کے پاس جوہری مواد موجود ہے اور وہ جاننے کا خواہش مند ہے کہ اس مواد سے جوہری ہتھیار کس طرح تیار کیا جا سکتا ہے؟" بہرنوع کوئی بھی ان مذاکرات کی اصل نوعیت سے آگاہ نہیں ہے، نہ ہی کسی کو یہ معلوم ہے کہ بشیر الدین محمود نے اسامہ بن لادن کے ساتھی کو کیا مشورہ دیا تھا، تاہم بشیر الدین محمود کے بیٹے کا بیان ہے کہ ان کے والد نے اسامہ بن لادن کو کسی بھی قسم کی مدد فراہم کرنے سے واضح طور پر انکار کر دیا تھا۔ اگر طالبان کی حکومت کا خاتمہ

نہ ہوجاتا تو ممکن ہے یہ تعلقات اور زیادہ پختہ اور مستحکم ہوجاتے۔ جب واشنگٹن میں خبر پہنچی کہ بشیر الدین محمود نے اسامہ بن لادن کے علاوہ ملا عمر سے بھی ملاقات کی ہے اور ان کے مابین جوہری ہتھیاروں کی بابت تبادلہ خیال ہوا ہے تو وہاں گویا ہلچل سی مچ گئی۔ امریکی سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ بہ نفس نفیس فوری طور پر اسلام آباد پہنچے تاکہ ذاتی طور پر اس تمام واقعے کی تحقیق کرسکیں۔ بہرکیف! پاکستانی حکام نے انھیں یقین دلایا کہ کسی بھی نوعیت کی حساس معلومات طالبان اور القاعدہ لیڈروں کو فراہم نہیں کی گئیں تاہم واشنگٹن میں یہ خدشات بدستور موجود تھے کہ بعض دیگر جوہری سائنسدان بھی افغانستان جاچکے ہیں۔ اس بات کے بھی کوئی شواہد موجود نہیں تھے کہ القاعدہ فزائل مواد حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکی ہے اور یہ خیال عام تھا کہ شاید وہ ایٹم بم کے مقابلے میں ڈرٹی بم بنانے میں مشغول ہے جس کی تیاری نسبتاً آسان اور قابل عمل ہے۔

دو پاکستانی جوہری سائنس دانوں کی گرفتاری

۲۳/اکتوبر کو پاکستان کے انٹیلی جنس حکام نے دونوں پاکستانی جوہری سائنس دانوں یعنی بشیر الدین محمود اور چودھری عبدالمجید کو حراست میں لے لیا اور ''امہ تعمیر نو'' کے ان دیگر افراد کو بھی گرفتار کرلیا گیا جن کے پاکستانی افواج سے خفیہ اور گہرے تعلقات تھے بالخصوص آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل کو جنھیں ''امہ تعمیر نو'' کا اعزازی سرپرست جانا جاتا تھا۔ جنرل حمید گل بھی بشیر الدین محمود سے کابل میں ملاقات کرچکے تھے، یہ وہی مہینہ ہے جس کے دوران بشیر الدین محمود نے اسامہ بن لادن سے ملاقات کی تھی۔ بہرکیف! جنرل حمید گل کا بیان ہے کہ انھیں اس بات کا قطعی کوئی علم نہیں ہے کہ بشیر الدین محمود اسامہ بن لادن سے مل چکے تھے۔ وال اسٹریٹ جرنل کے نمائندے ڈینیل پرل نے اپنے قتل سے کچھ ہی پہلے اس بات کا انکشاف کیا تھا۔ امریکی سی آئی اے نے آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر مشترکہ طور پر بشیر الدین محمود سے تفتیش کی تھی جس

کے دوران وہ جھوٹ پکڑنے والے آلے کے ذریعے ہونے والی تحقیقات میں چھ بار ناکام ثابت ہوئے۔ بہرنوع پاکستان سے جوہری معلومات اور اطلاعات کے افشا ہونے کے تمام تر خدشات کے باوجود اسلام آباد کے حکام سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے بارے میں تفصیلی چھان بین اور جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس وقت بہت سی دیگر ترجیحات بھی تھیں اور اس نیٹ ورک کے بارے میں ابھی بہت کچھ جاننا باقی تھا۔

دہشت گردی کے لیے وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیار

وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار تیار کرنے والے ممالک اور ریاستوں کے ہاتھ سے نکل کر ان ہتھیاروں کا مختلف سرگرم دہشت گرد گروہوں کے ہاتھ لگ جانا واشنگٹن کے لیے ایک انتہائی اہم اور سنگین مسئلہ بن چکا تھا۔ بش انتظامیہ میں موجود کلیدی حکام کے نزدیک جوہری ٹیکنالوجی اور ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا مسئلہ نہایت ترجیحی اہمیت کا حامل رہا تھا۔

تاہم نائن الیون کے دہشت گرد حملوں کے بعد یہ خدشات بھی جنم لے رہے تھے کہ اگر اب دہشت گردوں نے کوئی اور حملہ کیا تو ممکن ہے وہ غیر روایتی قسم کا جوہری اسلحہ استعمال کریں چنانچہ اس خوف اور خطرے کے پیش نظر ایک نئی پالیسی وضع کی گئی جس میں اس بات پر خاصا زور دیا گیا تھا کہ ایسی ریاستوں اور ممالک کو بالخصوص ایسی بدمعاش اور غنڈہ ریاستوں کو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تیاری سے روک دیا جائے۔ اس پالیسی کی رو سے ان جوہری نیٹ ورکس کو بند کرنے سے جو وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تیاری کا مواد اور معلومات فراہم کررہے تھے، یہ زیادہ بہتر سمجھا گیا تھا کہ ایسے ممالک کو روکا جائے جو اس قسم کے انتہائی تباہ کن ہتھیار تیار کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی صدر جارج بش نے جنوری ۲۰۰۲ء میں اسی حوالے سے

عراق، ایران اور شمالی کوریا جیسے ممالک کو "بدی کا محور" قرار دیا تھا۔ عراق پر امریکی فوج کشی کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ ایسی ریاستوں کو سبق سکھایا جائے جن کے بارے میں یہ خدشات لاحق رہتے ہیں کہ وہ مستقبل میں تباہ کن ہتھیار تیار کرلیں گے۔ امریکی افواج نے اتحادی حلیفوں کے ساتھ مل کر عراق کو اسی غرض سے نشانہ بنایا تھا تاکہ وہ ایک غنڈہ اور بدمعاش ریاست کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔

عراق کے بعد ایران پر امریکی فوج کشی

بش انتظامیہ کا منصوبہ غالباً یہی تھا کہ عراق پر فوج کشی کے بعد وہ ایران کی جانب توجہ دے گی تاکہ عراق میں موجود امریکی اور اتحادی افواج کے دباؤ میں آکر ایران مصالحانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجائے۔ واضح رہے کہ مئی ۲۰۰۳ء میں ایرانی حکومت نے اس وقت امریکی انتظامیہ سے مکالمے اور گفت وشنید کی خواہش کا اظہار کیا تھا جب عراق پر امریکی فوج کشی کے نتیجے میں اسے بھی ایسی ہی کسی صورت حال کا سامنا کرنے کا خوف لاحق تھا تاہم بعض اہم وجوہ کی بناء پر امریکی انتظامیہ نے ایران کی اس خواہش کو یکسر مسترد کردیا تھا جن میں سے ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسی زمانے میں سعودی عرب میں کار بم دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کی بابت ایران میں موجود القاعدہ کی قیادت نے ایسے احکام جاری کیے تھے جنھیں فون پر امریکی انٹیلی جنس اداروں نے واضح طور پر سن لیا تھا چنانچہ واشنگٹن میں یہ تاثر عام تھا کہ فی الوقت ایران سے مکالمے اور مذاکرات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ وہاں صدر محمد خاتمی اور ان کی اعتدال پسند حکومت کا حقیقی کنٹرول موجود نہیں تھا، لہٰذا ابھی یہ مناسب ہوگا کہ ایران مناسب فضا اور سازگار ماحول پیدا ہونے تک انتظار کرے۔ بہرکیف! فروری ۲۰۰۳ء میں جب بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی کے عہدیداروں نے ایران کے چھوٹے سے شہر نطنز کا دورہ کیا تو یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ ایران کی جوہری طالع آزمائی کا دائرہ کہاں تک پھیل چکا ہے۔ یہ واقعہ

عراق پر امریکی فوج کشی سے صرف چند ہفتے قبل کا ہے تاہم جب عراق میں شورش، بغاوت اور محاذ آرائی حد سے بڑھنے لگی اور پورے عراق تک اس کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو تہران پر دباؤ میں بھی نمایاں کمی واقع ہوگئی بلکہ اس کے برعکس ایران کی جوہری خواہشات میں بھی نمایاں اضافہ ہوگیا۔ جوں جوں عراق کے اندرونی حالات بگڑتے گئے اور وہاں کی صورتحال قابو سے باہر ہونے لگی اسی نسبت سے ایران کی جوہری صلاحیت حاصل کرنے کی کوششوں کو بھی دانستہ نظر انداز کرنا پڑا۔ امریکی انتظامیہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود ایران اور شمالی کوریا کے جوہری پروگرام کے حوالے سے موجود پالیسی مفلوج ہوچکی تھی اور امریکی پالیسی سازوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ ان دونوں ممالک کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ واشنگٹن کی تمام توجہ اور توانائیاں عراق پر مرکوز ہوچکی تھیں کیونکہ واضح طور پر وہی امریکی انتظامیہ کا پہلا ہدف تھا۔

بی بی سی چائنا-لیبیا کا جوہری پروگرام سے لاتعلقی کا اعلان

بی بی سی چائنا نامی بحری جہاز پر لیبیا جانے والے کنٹینروں کا راز فاش ہوچکا تھا۔ چنانچہ لیبیا کے سربراہ معمر قذافی کے پاس سوائے اس کے کوئی اور چارہ کار باقی نہ بچا تھا کہ عراق جیسا حشر کیے جانے سے قبل ہی وہ کوئی فیصلہ کن اعلان کردیں لہٰذا انھوں نے بڑے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جوہری پروگرام کی پیش رفت سے مکمل لاتعلقی اور علیحدگی کا اعلان کردیا جائے۔ ان کنٹینرز پر جو سینٹری فیوج میٹیریل لدا ہوا تھا اس کے حوالے سے پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر کا نام پہلے ہی امریکی اور برطانوی انٹیلی جنس ذرائع کی نظروں میں آچکا تھا۔

اسلام آباد میں صدر جنرل پرویز مشرف کو الگ تشویش اور فکر لاحق ہوچکی تھی۔ لیبیا کا یہ اعلان بڑے نازک وقت اور موقع پر سامنے آیا تھا۔ اب صدر پرویز مشرف کے لیے بھی یہ تقریباً ناممکن ہو چلا تھا کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی سرگرمیوں کو مزید کسی

پردے میں رکھ سکیں یا ان کا موزوں انداز میں دفاع کریں۔ پوری دنیا میں ڈاکٹر عبدالقدیر نیٹ ورک کو زبردست دھچکا پہنچا تھا اور یہ سمجھا جارہا تھا کہ یہ کھیل اب اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ بی بی سی چائنا نامی بحری جہاز کے ذریعے لیبیا جانے والے پراسرار سامان اور لیبیا کی حکومت کے جوہری پروگرام سے لاتعلقی کے اس اعلان نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی مکمل تباہی کا سامان کردیا تھا اور وہ اب کھل کر دنیا کے سامنے آچکے تھے۔ بی بی سی چائنا نامی بحری جہاز کے ذریعے لیبیا جانے والے پراسرار سامان اور اور لیبیا کی حکومت کے جوہری پروگرام سے لاتعلقی کے اعلان کے مابین پوشیدہ تعلق نے ایسی قابل اعتماد اور مصدقہ اطلاعات فراہم کردی تھیں جن کے نتیجے میں اس نیٹ ورک کا تعاقب کرنا اب زیادہ آسان اور کارگر ہوچکا تھا۔ وقت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ہاتھوں سے تیزی کے ساتھ نکلتا جارہا تھا۔

نیویارک: ۲۴ر ستمبر ۲۰۰۳ء

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شرکت کی غرض سے دنیا بھر کے سربراہان مملکت، وزرائے اعظم اور ڈکٹیٹر حضرات نیویارک پہنچ چکے تھے۔ اس قسم کے اجتماعات میں دنیا کے مختلف ممالک کے سربراہان کے مابین وہ ملاقاتیں اور بات چیت بہت زیادہ دلچسپی کی حامل تصور کی جاتی ہے جو جنرل اسمبلی کے اجلاس سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ اس نوعیت کی ملاقاتوں میں یہ سربراہان مملکت باہمی طور پر سفارتکاری کے ذریعے مختلف قسم کے موضوعات اور مسائل پر مکالمے اور گفت وشنید کے مواقع تلاش کرلیتے ہیں جس کے لیے انھیں ایک دوسرے کے ممالک کا رسمی طور پر کوئی سرکاری دورہ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ بہرکیف اس موقع پر سب سے زیادہ دلچسپی اس امکان کے بارے میں ظاہر کی جاتی ہے کہ امریکی صدر کس ملک کے سربراہ کو بات چیت کے لیے بلانے کا شرف بخشتے ہیں یا کے ملاقات کے قابل سمجھتے ہیں۔ ایسے مواقع پر یہ بات بہت زیادہ اہم ہوتی ہے کہ

امریکی صدر کے انتہائی بیش قیمت مصروفیات کے یہ لمحات کس خوش نصیب کے حصے میں آتے ہیں؟؟ اس دن صبح کو امریکی صدر جارج بش کو ناشتے پر کیریبین کے لیڈروں سے ملنا تھا جس کے بعد انھوں نے گھانا، موزمبیق اور بھارت کے وزرائے اعظم کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا لیکن اسی روز ایک ملاقات ایسی بھی ہونے والی تھی جس کی ایک خصوصی اہمیت تھی۔ متعدد بار کی یاددہانیوں اور تنبیہات کے بعد آج بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا تھا کہ اس معاملے کو پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کے روبرو رکھ دیا جائے۔ اس بات کی پوری امید کی جارہی تھی کہ اب جنرل پرویز مشرف ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی سرگرمیوں اور کارگزاریوں کو مزید پوشیدہ رکھنے یا پردۂ اخفا میں پڑے رہنے دینے کے متحمل نہیں ہو پائیں گے؟ چنانچہ امریکی سی آئی اے کے اس وقت کے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ نے ہوٹل کے اس کمرے میں پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ وقت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ہاتھوں سے نکلا جارہا تھا تاہم ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ سی آئی اے کی اعلیٰ ترین شخصیات کی جانب سے بعض اہم ترین انکشافات کے بعد بھی پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف کو ان کے خلاف کسی بھی کارروائی کے لیے ابھی مزید وقت درکار تھا۔

گویا ہزاروں لغزشیں حائل تھیں لب تک جام آنے میں!!

ڈاکٹر قدیر نیٹ ورک سے نمٹنے میں حائل مصلحتیں

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی گردن کے اطراف میں پھندا کسنا شروع کیا جاچکا تھا لیکن یہ کافی سست رفتاری کا شکار تھا۔ ایک کے بعد ایک کرکے ان کے گاہکوں کا خفیہ جوہری پروگرام آہستہ آہستہ بے نقاب ہوتا جارہا تھا اور اس سلسلے میں سارے ڈانڈے بالآخر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک سے ہی جاکر ملتے تھے۔ بہرطور کافی طویل عرصے تک شواہد اور ثبوت کافی کمزور تھے جبکہ اس کے برعکس ان کی شہرت کی ڈھال بے حد مضبوط تھی جس کے

سب اُن پر کوئی کاری ضرب لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ دوسری جانب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بھی اس بات کا مکمل اعتماد تھا کہ کوئی "مائی کا لال" انھیں روکنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ اس کا بنیادی سبب وہ تعلقات تھے جو امریکا اور پاکستان کے مابین نہایت پیچیدہ نوعیت کے حامل تھے اور تہہ در تہہ نزاکتوں کے متقاضی تھے۔ عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ امریکا کے لیے ایک بنیادی اور ترجیحی مسئلہ تھا جس کے لیے اسے پاکستان کی مکمل تائید و حمایت اور مدد درکار تھی۔ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کو اس باہمی تعاون کا واحد ضامن تصور کیا جاتا تھا لیکن وہ ایک ایسے لیڈر تھے جن کی اپنی پوزیشن کافی کمزور تھی، چنانچہ امریکی انتظامیہ کے حلقوں میں یہ تاثر عام تھا کہ جنرل پرویز مشرف کی تائید وحمایت کو کھودینا بہر صورت ایک بہت بڑی بھول اور غلطی کے مترادف ہوگا لہٰذا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف کیے جانے والے کسی بھی اقدام پر عملدرآمد کرتے وقت اس نازک صورت حال کو پیش نظر رکھنا ازحد ضروری ہوگا کہ ایسا کرتے وقت جنرل پرویز مشرف کی حیثیت اور مقام کو کوئی ایسا نقصان نہ پہنچے جس میں وہ اقتدار سے محروم ہوجائیں۔

نائین الیون کے بعد کی صورت حال اور عبدالقدیر نیٹ ورک

۱۱رستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے فوراً بعد یہ امید ظاہر کی جارہی تھی کہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے ایک مرکزی اور کلیدی اتحادی ہونے کی حیثیت سے پاکستانی حکومت کو کچھ عرصے کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر نیٹ ورک کے خلاف کسی اقدام میں تاخیر ہوسکتی ہے کیونکہ دہشت گردی کے خلاف اپنی جنگ کو پوری شدت کے ساتھ جاری وساری رکھنے کی غرض سے امریکی اور مغربی حکومتوں کو پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کی بھرپور تائید اور حمایت کی اشد ضرورت تھی جس کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ امریکی انٹیلی جنس کو اس بات کی بھی اطلاعات مل چکی تھیں کہ القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن اور تنظیم کے دیگر لیڈر افغانستان سے ترک

سکونت کرکے پاکستان کے سرحدی قبائلی علاقوں میں روپوش ہوچکے ہیں چنانچہ ان کے تعاقب اور تلاش کی غرض سے بھی جنرل پرویز مشرف کا اشتراک اور تعاون بے حد ضروری ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک سے نمٹنا بھی امریکی حکومت کے لیے ازحد اہم تھا لیکن اس کی اہمیت اتنی بھی نہیں تھی کہ اس کے نتیجے میں پاکستان کسی ایسے داخلی بحران اور اندرونی خلفشار کا شکار ہوجائے جو بالآخر جنرل پرویز مشرف کے زوال پر منتج ہو!! دوسری جانب ایٹمی سائنس دان عبدالقدیر خان کو پاکستانی افواج کے علاوہ اسلام پسند حلقوں میں بھی غیر معمولی مقبولیت اور پسندیدگی حاصل تھی۔ جنرل پرویز مشرف بہر صورت امریکا کے ایک ایسے کمزور اتحادی تھے جن کے اقتدار کو ایسے ہی عناصر کی جانب سے سنگین خطرات لاحق تھے تاہم جنرل پرویز مشرف اپنی تمام تر کمزوری اور نازک پوزیشن کے باوجود بھی امریکا کے لیے قابل قبول تھے کیونکہ ان کا کوئی بھی متبادل یا جانشین ان سے بھی کہیں زیادہ کمزور اور ناتواں ثابت ہوسکتا تھا چنانچہ امریکی حکومت کے لیے جنرل پرویز مشرف ہی وہ واحد شخصیت تھے جسے اس نے بادل نخواستہ قبول کررکھا تھا۔ دوسری جانب پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف کو نہ صرف اپنی اس منفرد انمول پوزیشن اور مقام کا بخوبی ادراک تھا بلکہ وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنے کے تمام طریقوں سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھے۔ ایسے حالات میں جنرل پرویز مشرف پر سخت دباؤ ڈال کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف کسی سخت اقدام کا مطالبہ کرنے سے قبل بہت سی مصلحتوں اور سمجھوتوں کو پیش نظر رکھنا بھی بے حد ضروری تھا۔

امریکی حکومت کے لیے پاکستان کی ضرورت؟؟؟

پاکستان کے پالیسی سازوں کے ذہن میں ۱۹۹۰ء کے عشرے کی یادیں اب تک تازہ تھیں جب افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے بعد امریکی حکومت نے پاکستان سے یکسر نظریں پھیر لی تھیں کیونکہ اس کے مقاصد حاصل ہوچکے تھے۔ چناں چہ اس تلخ

تجربے کو اپنی یادداشت میں محفوظ رکھ کر انھوں نے اس امکان پر غور کرنا شروع کر دیا کہ اگر اسامہ بن لادن کو گرفتار کر لیا گیا اور القاعدہ کا خاتمہ ہو گیا تو امریکا کے لیے پاکستان کی ضرورت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی اور وہ امریکا کے لیے کسی بھی کام کا نہیں رہے گا۔ امریکا ایک بار پھر اپنا مقصد پورا ہو جانے کے بعد پاکستان کو یک و تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔ یہ ایک ایسا امکان ہے جو ہر لمحہ جنرل پرویز مشرف کے ذہن میں مچلتا رہتا ہے۔ بقول ان کے انھیں اچھی طرح یاد ہے کہ افغانستان میں روسی افواج کی مداخلت کے پورے زمانے میں امریکا نے پاکستان کو ہر ممکن امداد فراہم کی تھی اور جب روسی افواج افغانستان سے واپس چلی گئیں تو امریکا نے آنکھیں پھیر لیں اور ہمیں یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہمارے ساتھ کسی نے بہت بڑا دھوکا کیا ہے اور اپنا مطلب نکل جانے کے بعد ہمیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ بہر صورت یہ ایک ایسا زخم ہے جسے مندمل ہونے میں کچھ عرصہ تو درکار ہوگا۔ پاکستان میں یہی خوف کارفرما ہے کہ جونہی دہشت گردوں اور دہشت گردی کے خلاف موجودہ جنگ ختم ہوگی اسے ایک بار پھر تنہائی کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ امریکی حکومت کی یہی روایت رہی ہے کہ اپنا مطلب نکال کر وہ آنکھیں پھیر لیا کرتی ہے۔ بہرکیف جنرل پرویز مشرف نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ امریکی حکومت نے مجھ سے جو وعدے کیے ہیں ان سے مجھے یہ یقین ہو چلا ہے کہ امریکا نے ماضی کی غلطیوں سے بہت سبق سیکھا ہے اور وہ دوبارہ ان کا مرتکب نہیں ہوگا۔ بقول مشرف کے "ایسا کرنا خود امریکا کے اپنے مفاد میں بھی نہیں ہوگا۔"

واشنگٹن سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں شمالی کوریا کے حوالے سے آنے والی خبروں اور شکایات کا سلسلہ ۱۹۹۸ء سے جاری تھا لیکن ان میں مطلوبہ تفاصیل کا فقدان تھا۔ ایک امریکی افسر جس نے عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے بارے میں یہ اطلاعات پہنچائی تھیں اس کا کہنا ہے کہ ان کا مقصد صرف اور محض صدر جنرل پرویز مشرف کو یاددہانی

کرانا تھا تاکہ یہ مسئلہ ان کے ذہن میں موجود رہے تاہم اس کا مقصد کسی بھی قسم کی محاذ آرائی یا عبدالقدیر خان نیٹ ورک کے خلاف کسی تادیبی اقدام سے ہرگز نہ تھا۔ بہرکیف رفتہ رفتہ اس سلسلے میں ایسے معتبر شواہد بھی دستیاب ہو گئے تھے جن پر ان کے ذرائع سے کوئی سمجھوتا کیے بغیر ہی عملدرآمد ممکن تھا۔ جنرل پرویز مشرف نے ۲۰۰۱ء میں بعض اقدام کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو سائیڈ لائن کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش اتنی مؤثر اور کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ملک میں غیر معمولی شہرت حاصل تھی اور ان کے حامیوں کا ایک بڑا حلقہ بھی موجود تھا جو یقیناً تعداد میں جنرل مشرف کی تائید و حمایت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ ایسے حالات میں کسی بھی پاکستانی سیاسی لیڈر کے لیے کافی دشوار تھا کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف کوئی اقدام کر سکے۔

پاکستانی طیاروں کی منزلِ مقصود- پیانگ یانگ

امریکی حکومت کی جانب سے پاکستان کو متعدد بار خبردار کیا جا رہا تھا تاہم اس کا کوئی واضح اور نمایاں اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہرکیف! ۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں اس بات کے مزید شواہد فراہم ہوئے کہ شمالی کوریا اور پاکستان کے مابین طیاروں کا رخ پیانگ یانگ کی جانب ہوتا ہے۔ جولائی کے مہینے میں جاسوس سیٹ لائٹ ذرائع کی مدد سے یہ پتا چلا لیا گیا تھا کہ پاکستانی فضائیہ کے ٹرانسپورٹ طیارے C-130 شمالی کوریا کے ہوائی اڈوں پر اترتے دیکھے گئے ہیں جہاں ان طیاروں پر میزائل کے مختلف حصوں کو لادا جاتا ہے تاہم میزائل کے ان حصوں کی بہ نسبت وہ آئٹمز زیادہ تشویش کا باعث تھے جنھیں پاکستانی طیارے پیانگ یانگ ایئرپورٹ پر اتارا کرتے تھے۔ یہ کام بڑے زور و شور سے علی الاعلان جاری تھا اور اسے چھپانے کی غرض سے کوئی کوشش بھی نہیں کی جاتی تھی، چنانچہ سیکرٹری آف اسٹیٹ کولن پاول نے فوری طور پر پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف سے ٹیلی فون پر رابطہ کرتے ہوئے اپنی شدید ناراضگی اور تشویش کا اظہار

کیا..... انھوں نے جنرل مشرف کو بتایا کہ "امریکی حکومت اس بات سے تو آگاہ نہیں ہے کہ ان طیاروں پر کیا لدا ہوتا ہے تاہم اسے شبہ ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ مشرف نے جواباً کہا کہ پاکستانی طیارے شمالی کوریا کو ناقص سازوسامان واپس کر کے اس کے عوض کندھوں پر رکھ کر چلائے جانے والے SA-16 میزائل حاصل کر رہے ہیں۔" کولن پاول نے جنرل مشرف کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ "ایسے نازک موقع پر اسلام آباد کو اس قسم کا سنگین خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟؟ اگر صورت حال اسی طرح جاری رہتی ہے تو پاکستان کے ساتھ دیگر تمام شعبوں میں مل کر کام کرنا امریکی حکومت کے لیے خاصا دشوار ہو جائے گا۔" بہرحال جنرل مشرف نے امریکی وزیر خارجہ کو یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ اب ایسی باتوں کا اعادہ نہیں ہوگا۔

شمالی کوریا کا یورینیم افزودگی کا پروگرام اور پاکستانی تعاون

شمالی کوریا کی جانب سے یورینیم افزودگی کا پروگرام اب کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں تھا۔ امریکی اقتدار کے حلقوں میں شک بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ پاکستان نے یورینیم کو افزودہ کرنے کی ٹیکنالوجی شمالی کوریا کو فراہم کی ہے۔ اس بات کے سامنے آتے ہی امریکی انتظامیہ کے حلقوں میں اس کی بابت زور و شور سے تبادلۂ خیال اور بحث مباحثہ شروع ہو گیا کہ اب کیا اقدام کیا جائے؟؟ تاہم امریکی انتظامیہ کے ان حلقوں پر شدید دباؤ تھا کہ اس معاملے میں جنرل پرویز مشرف کو زیادہ چھیڑنا مناسب نہیں ہوگا امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کا کہنا تھا کہ انھوں نے اس سلسلے میں صدر جنرل پرویز مشرف سے تفصیلی بات چیت کی ہے اور انھوں نے چار سو فیصد یقین دہانی کرائی ہے کہ پاکستان اور شمالی کوریا کے مابین کسی بھی قسم کا جوہری تبادلہ نہیں ہو رہا۔ بہر طور کولن پاول نے اس سلسلے میں مناسب اقدام پر زور دیتے ہوئے عوامی سطح پر کسی بھی تشویش یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ انھیں احساس تھا کہ جنرل پرویز مشرف اپنے وعدے کے بقول اس معاملے

سے نمٹنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ نائن الیون کے واقعات سے قبل کولن پاول نے پاکستانی لیڈروں سے شاید ہی کبھی کوئی بات کی ہو لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی چنانچہ انھوں نے جنرل پرویز مشرف سے انتہائی قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم کر لیے جنھیں ایک وزیر خارجہ اور ایک سربراہِ مملکت کے مابین خلافِ معمول اور غیر معمولی تعلقات ہی سمجھا جائے گا چنانچہ جب تک کولن پاول امریکا کے وزیر خارجہ رہے اس وقت تک جنرل پرویز مشرف اور ان کے مابین ٹیلی فون پر اسّی (۸۰) مرتبہ گفتگو ہو چکی تھی جس سے ان دونوں کے درمیان تعلقاتِ کار کی اصل نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے.....

ان دونوں میں ایک قدر مشترک بھی موجود تھی۔ دونوں فوجی جنرل تھے جو اب سیاست میں آ چکے تھے اور اپنی صاف گوئی اور راست اندازِ گفتگو کی وجہ سے ایک دوسرے کے کافی قریب تھے۔ امریکی انتظامیہ اور حکام کا یہ بھی خیال تھا کہ صدر جنرل پرویز مشرف اپنی بات کے پکے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ دورانِ گفتگو اپنے الفاظ کا انتخاب اور استعمال بڑی دیکھ بھال اور احتیاط سے کرتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے علاوہ بھی دیگر موضوعات اور مسائل کے بارے میں امریکی حکام کو جنرل پرویز مشرف سے بات چیت کے دوران اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

خان ریسرچ لیبارٹریز اور شمالی کوریا پر امریکی پابندیاں

مارچ ۲۰۰۳ء میں خان ریسرچ لیبارٹریز (کے آر ایل) اور شمالی کوریا پر امریکا کی جانب سے پابندی عائد کر دی گئی۔ بنیادی طور پر یہ پابندی شمالی کوریا کی جانب سے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی کی فراہمی کے تناظر میں عائد کی گئی تھی تاہم امریکی انتظامیہ کو یہ شبہات بھی تھے کہ پاکستان اور شمالی کوریا کے مابین جوہری شعبے میں باہمی تعاون کا سلسلہ بھی چل رہا ہے۔ خان ریسرچ لیبارٹریز پر براہِ راست اور انفرادی طور پر پابندیاں عائد کرنے کا مقصد حکومت پاکستان کو یہ پیغام دینا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے

خلاف کوئی سخت اقدام کیا جائے۔ بہرکیف اس نوعیت کے پیغام سے جنرل پرویز مشرف کی شخصیت اور منصب پر کسی قسم کا منفی تاثر مرتب نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ پابندیاں حکومت پاکستان پر نہیں بلکہ کے آر ایل پر عائد کی گئی تھیں (تاہم امریکی حکومت کے اس اقدام پر جنرل پرویز مشرف نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اس ضمن میں مزید ثبوت اور شواہد فراہم کیے جائیں، وہ مسلسل اس بات سے انکار کرتے رہے کہ پاکستان نے جوہری یا میزائل ٹیکنالوجی کسی دوسرے ملک کو فراہم کی ہے۔ بہرکیف ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف عائد کردہ الزامات کے حوالے سے جنرل پرویز مشرف نے مزید شواہد کا مطالبہ جاری رکھا......

امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا "اگر امریکی حکومت کو ان سرگرمیوں کا علم تھا تو اسے ہمیں پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے تھا اس طرح ممکن ہے وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو چکا ہے۔" چنانچہ جب کبھی امریکی حکام ان سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف کچھ کرنے کو کہتے جنرل پرویز مشرف کا انھیں یہی جواب ہوتا تھا۔

نطنز: ایران میں یورینیم افزودگی کا انکشاف

پاکستان اور شمالی کوریا کے مابین مشکوک نوعیت کے جوہری تعاون اور تبادلے کے تعلقات سامنے آنے کے بعد اگست ۲۰۰۲ء میں ایران کے شہر نطنز میں یورینیم کی افزودگی کا انکشاف ہوا جس کے بعد اس نوعیت کے سوالات عام طور سے پوچھے جانے لگے کہ ایران کو ملنے والی یہ مدد کہاں سے آ رہی ہے؟؟ کون اسے یہ ساری ٹیکنالوجی اور معلومات فراہم کر رہا ہے؟؟ بہرکیف مئی ۲۰۰۳ء تک بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ پاکستان ایران کو یہ ساری معلومات فراہم کر رہا ہے...... آگے چل کر ایرانی حکام نے یہ تسلیم کر لیا کہ انھیں پاکستان سے سینٹری فیوج ملے تھے۔ رفتہ رفتہ ایرانی حکام نے تمام حقائق بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی کو بتا دیے جس کے بعد مذکورہ ایجنسی نے پاکستانی حکومت سے مزید وضاحتیں طلب کر لیں۔

پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف سے براہِ راست تفتیش کی کوشش

جون ۲۰۰۳ء کے اواخر میں پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف سے براہِ راست تحقیق و تفتیش کی کوششوں کے بارے میں سوچا جانے لگا تاہم اس حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ پاکستانی لیڈر کو اس ضمن میں کسی اقدام اور فیصلے کے لیے راضی کرنے کی غرض سے یہ ضروری تھا کہ تمام تفصیلات ذاتی اور شخصی طور پر ان کے علم میں لائی جائیں اور وہ بھی انتہائی اعلیٰ ترین سطح کی ملاقات کے دوران۔ اسی اثناء میں صدر جنرل پرویز مشرف کے غیر ملکی دورے کا اعلان ہوا جس کے دوران انھیں پہلے لندن اور وہاں سے امریکا جانا تھا۔ امریکا میں بوسٹن سے ہوتے ہوئے وہ واشنگٹن پہنچے تاکہ امریکی صدر، نائب صدر، وزیر خارجہ اور دیگر اعلیٰ امریکی حکام سے ملاقاتیں کر سکیں۔ تاہم ایک بات طے شدہ تھی کہ اس موضوع کو لندن میں نہیں چھیڑا جائے گا بلکہ امریکی حکومت یہ مسئلہ ان کے روبرو اس وقت اٹھائے گی جب وہ واشنگٹن آنے کے بعد امریکی صدر کی دعوت پر کیمپ ڈیوڈ کا دورہ کریں گے لیکن جونہی پاکستانی صدر کا طیارہ ۲۰ر جون ۲۰۰۳ء کو لندن ایئرپورٹ سے بوسٹن آنے کے لیے فضا میں بلند ہوا امریکی حکام نے برطانیہ میں موجود ہم منصبوں کو آگاہ کیا کہ طے شدہ منصوبہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب کیمپ ڈیوڈ میں صدر جنرل مشرف سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس کے لیے ہمیں مزید انتظار کرنا ہوگا۔ تاہم منصوبے میں اس اچانک تبدیلی کی قطعاً کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ بہرحال یہ ان امریکی حکام کے لیے خاصی فکر انگیز اور تشویشناک خبر تھی جو برطانیہ میں ڈاکٹر عبدالقدیر نیٹ ورک کے بارے میں تحقیقات کر رہے تھے۔ اسی دوران میں لیبیا کی حکومت سے کیے جانے والے مذاکرات بھی تعطل کا شکار ہو گئے، لہٰذا نائن الیون کے بعد وقوع پذیر ہونے والے بعض پیچیدہ نوعیت کے واقعات نے اس مشکل سفر کو مزید سست روی کا شکار بنا دیا تھا۔

ستمبر ۲۰۰۳ء کے آتے آتے امریکی سی آئی اے، برطانوی خفیہ ایجنسی M-16، بی بی سی چائنا نامی بحری جہاز کے بارے میں تحقیقات کر رہی تھیں اور یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس بحری جہاز کو راستے ہی میں روک کر اس کی تلاشی لی جائے گی۔ واقعات انتہائی برق رفتاری کے ساتھ گزرتے جا رہے تھے۔ اگر لیبیا جوہری توانائی کے معاملے میں ملوث پایا جاتا ہے تو ایسی صورت میں جنرل پرویز مشرف سے پوچھ تاچھ اور ضروری ہو جائے گی؟؟ چنانچہ یہی ہوا بھی...... بی بی سی چائنا پر لدے دو کنٹینرز لیبیا ہی جا رہے تھے جن میں سینٹری فیوج کا مکمل سامان موجود تھا جو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی جانب سے دبئی میں اس بحری جہاز پر چڑھائے گئے تھے۔ اس انکشاف کے بعد اب یہ انتہائی ضروری ہو چکا تھا کہ صدر جنرل پرویز مشرف کے ساتھ دوبدو بیٹھ کر بات کی جائے اور اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا جائے۔ نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا، چنانچہ اس سے زیادہ بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ صدر جنرل پرویز مشرف اور امریکی صدر جارج بش دونوں نیویارک میں موجود ہوں گے اور ان دونوں کے درمیان ہونے والی خفیہ بات چیت مکمل طور پر صیغۂ راز میں رہے گی۔ امریکی صدر اور پاکستان کے جنرل پرویز مشرف کے مابین ہونے والی اس بات چیت کے لیے نیویارک کے مشہور زمانہ ہوٹل "والڈورف اسٹوریا" کی ۳۵ ویں منزل پر واقع کمرے کا انتخاب کیا گیا تھا جہاں امریکی صدر ٹھہرے ہوئے تھے اور جس کا کرایہ سات ہزار ڈالر یومیہ تھا۔ امریکی صدر اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی اجلاس میں شریک ہونے کے لیے نیویارک آتے تو اسی ہوٹل میں قیام کیا کرتے تھے اور یہیں اپنے کمرے میں وہ غیر ملکی سربراہان مملکت سے باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت بھی کیا کرتے تھے۔

جنرل پرویز مشرف اور جارج بش کی ملاقات

۲۴ ستمبر ۲۰۰۳ء کو امریکی صدر جارج بش نے پاکستان کے صدر جنرل پرویز

مشرف سے اپنے ہوٹل کے کمرے میں ملاقات کی۔ دونوں حضرات گہرے رنگوں کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ ملاقات کے اختتام پر وزارت خارجہ کی جانب سے پریس بریفنگ کے دوران بتایا گیا کہ دونوں سربراہان کے درمیان جن اہم موضوعات پر گفت و شنید ہوئی ان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ...... عراق کے لیے فوجی دستوں کی روانگی ...... کشمیر اور بھارت کے ساتھ مذاکرات کے موضوعات شامل تھے۔ دونوں صدور کے درمیان یہ ملاقات ایک گھنٹے تک جاری رہی جس کے بعد صدر بش نے جنرل پرویز مشرف کو مطلع کیا کہ ایک اور امریکی عہدیدار ان سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں اور انھیں بڑے غور اور دھیان سے ان کی بات سننا ہوگی۔

جارج ٹینیٹ کی پرویز مشرف سے ملاقات

پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کے لیے آنے والے یہ امریکی عہدیدار دراصل سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ تھے۔ انھوں نے وہ تمام تر ثبوت، شواہد اور تفصیلات جنرل پرویز مشرف کے روبرو رکھ دیں جنھیں امریکی سی آئی اے اور برطانوی سراغ رساں اداروں نے مل کر جمع کیا تھا، جن میں اس حقیقت کے ناقابل تردید اور غیر متنازعہ ثبوت موجود تھے کہ پاکستان کے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان جوہری ٹیکنالوجی فروخت کر کے بھاری رقومات اور منافع حاصل کر رہے ہیں۔ جارج ٹینیٹ نے جو دستاویزات دکھائیں ان میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے غیر ملکی دوروں، اکٹھی کی ہوئی دولت، بینک اکاؤنٹس، ان کے نیٹ ورک کا دائرہ کار، دیگر ممالک کو ان کی جانب سے کی گئی پیشکش کے علاوہ ان ممالک کی تفاصیل بھی موجود تھیں جنھوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر کے نیٹ ورک سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا تھا جن میں ایران بھی شامل تھا۔ بعض انٹیلی جنس معلومات ایسی تھیں جنھیں جانچ پڑتال اور بڑے غور و خوض کے بعد ان کے حقیقی ذرائع کا نام لیے بغیر پیش کیا گیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ صدر مشرف اس مرتبہ دعویٰ نہ کر سکیں کہ پیش کردہ تمام شواہد

ناکافی اور نامکمل ہیں، لہٰذا وہ اس سلسلے میں کوئی تادیبی کارروائی کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ بہرصورت ان دستاویزات اور شواہد میں ڈاکٹر خان کی سرگرمیوں کے ناقابلِ تردید ثبوت موجود تھے جنھیں دیکھنے کے بعد صدر جنرل پرویز مشرف ہکابکا رہ گئے اور کسی حیلے بہانے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا۔

بعدازاں انھوں نے جوہری پھیلاؤ کے ضمن میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے کردار اور اس کے انکشاف کو اپنی زندگی کا حیران کر دینے والا لمحہ قرار دیتے ہوئے اسے اپنے لیے ایک عظیم چیلنج کے مترادف قرار دیا تھا۔ ''مجھے ایسا لگا جیسے میں، شیطان اور گہرے سمندر کے درمیان کہیں کھڑا ہوں۔'' بہرصورت وہ دن پاکستانی صدر کے لیے بدترین دن تھا، اسی دن انھیں روس کے صدر پیوٹن سے بھی ملنا تھا لیکن ٹریفک کا بہانہ بنا کر انھوں نے یہ ملاقات ملتوی کر دی تھی۔

جارج ٹینیٹ سے ان کی اس ملاقات کو قطعاً خفیہ اور صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ اس ملاقات کے تقریباً دو ہفتے بعد اعلیٰ سطح کا ایک امریکی وفد اسلام آباد پہنچا۔ ۶/اکتوبر کو رچرڈ آرمیٹج اور اسسٹنٹ سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے جنوبی ایشیا کرسٹینا روکا راولپنڈی کے آرمی ہاؤس میں صدر جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کی غرض سے پہنچ گئے اور ان کے ساتھ دہشت گردوں کے خلاف عالمی جنگ کے علاوہ کشمیر کے موضوع پر گفتگو کی جس کے بعد ان دونوں نے سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ کے انکشافات پر گفت و شنید کا آغاز کیا۔ انھوں نے فوری طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف اقدام کا مطالبہ کرتے ہوئے صدر پاکستان کو باور کرایا کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو پاک امریکا تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ نائن الیون کے بعد امریکی حکومت سے قائم ہونے والے قریبی تعلقات کا فائدہ نہ اٹھایا جائے...... رچرڈ آرمیٹج کو اس خطے میں اپنی طویل کارکردگی اور فوجی پس منظر کے تناظر میں اسلام آباد کے سرکاری حلقوں

میں خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ جون ۲۰۰۲ء کے دوران انھوں نے پاکستان اور بھارت کے مابین تعلقات کی تلخی کو کم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجے میں ان دونوں ممالک کے مابین جوہری جنگ شروع ہو سکتی تھی۔ چنانچہ موجودہ مرحلے میں اور اس کے بعد بھی پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کے حوالے سے پائی جانے والی تشویش کا تعلق اس حقیقت سے نہیں تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان انھیں فروخت کرنے میں مصروف ہیں بلکہ اصل تشویش یہ تھی کہ پاکستان ان جوہری ہتھیاروں کو بھارت کے خلاف استعمال کر کے اس خطے میں جوہری جنگ کی آگ کے شعلوں کو ہوا نہ دے دے۔

بھارتی پارلیمنٹ کی عمارت پر دسمبر ۲۰۰۱ء میں ہونے والے حملے کے نتیجے میں جوہری جنگ کا خطرہ برصغیر کی دہلیز تک آن پہنچا تھا لیکن رچرڈ آرمیٹج، کولن پاول اور برطانوی سیکرٹری خارجہ جیک اسٹرا نے بروقت مداخلت کر کے اس خطرے کو ٹال دیا تھا۔ امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج نے جب انٹیلی جنس تجزیہ کاروں کے ایک گروپ سے یہ سوال کیا کہ پاکستان اور بھارت کے مابین جوہری جنگ کا کوئی خطرہ موجود ہے تو ان سب نے بیک آواز اس خطرے کی تائید کی تھی۔ جنوبی ایشیا میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پاک بھارت جوہری جنگ کے امکانات اور خطرات ہی نے ان دو ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف کسی بھی جنگی اقدام سے روک رکھا ہے، چنانچہ اس خیال نے بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شہرت کو مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے کیونکہ ایٹم بم بنا کر انھوں نے پاکستان کو تحفظ اور سلامتی فراہم کی ہے۔

نیٹ ورک کے خلاف ٹھوس ثبوت

امریکی سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ سے جنرل پرویز مشرف کی ملاقات کو مکمل طور پر صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے پاکستانی حکام نے بعدازاں رچرڈ آرمیٹج کی جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کو اس مسئلے کا حرفِ آخر قرار دیتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ

اس ملاقات کے دوران ہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت اور ناقابل تردید شواہد پیش کیے گئے تھے جن کے نتیجے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف انتہائی سخت اقدام کرنا پڑا۔ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کا کہنا ہے کہ رچرڈ آرمٹیج سے ملاقات کے بعد ہی اصل معاملہ شروع ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان بڑے پیمانے پر اس معاملے میں ملوث ہیں، اس کے بعد ہی ہم نے ان کے خلاف اپنی تحقیقات کا آغاز کیا۔ پاکستانی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ امریکی حکام نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف جو ثبوت اور شواہد پیش کیے تھے انھیں دیکھنے کے بعد تو گویا صدر جنرل پرویز مشرف کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے امریکیوں کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ایک ایک نقل و حرکت اور اقدام کا علم ہے۔ تاہم مزے کی بات تو یہ ہے کہ ان تمام شواہد کے باوجود ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو مزید آگے بڑھنے سے نہیں روکا گیا۔

نیٹ ورک کے گرد گھیرا تنگ

دسمبر ۲۰۰۳ء تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس بات کا شک ہو چکا تھا کہ ان کے گرد گھیرا لمحہ بہ لمحہ اور روز بروز تنگ کیا جا رہا ہے۔ نومبر کے اواخر سے کے آر ایل میں ان کے سینئر ساتھی ایک کے بعد ایک کر کے حراست میں لے لیے گئے تھے۔ پاکستانی انٹیلی جنس اداروں نے سب سے پہلے محمد فاروق اور یاسین چوہان کو اٹھا لیا۔ یہ دونوں کے آر ایل میں بحیثیت ڈائریکٹر کام کر رہے تھے۔ اسلام آباد میں یہ افواہیں بھی زور پکڑ گئیں کہ اس موقع پر انگریزی زبان بولنے والے غیر ملکی افراد بھی موجود تھے جس کا مطلب ہے سی آئی اے اور ایف بی آئی کے لوگ بھی اس معاملے میں شریک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایران اور لیبیا سے جوہری تبادلے میں محمد فاروق نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ ان دونوں ڈائریکٹرز کے علاوہ ایک درجن سے زائد افراد کو کے آر ایل سے گرفتار کر کے ان سے پوچھ گچھ کی گئی۔

ان کے گھروں کی نگرانی شروع ہو گئی اور آئی ایس آئی نے ان کے پاسپورٹ ضبط کر لیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اب تک کن کن ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے کہا گیا کہ وہ ان افراد کے بینک اکاؤنٹس کی مکمل چھان بین کرے۔ اس وقت تک صرف یہ خبریں آ چکی تھیں کہ پاکستان نے ایران کو جوہری ٹیکنالوجی کی بابت اہم معلومات فراہم کی ہیں، تاہم "بی بی سی چائنا" کے ذریعے لیبیا جانے والے سینٹری فیوجز کی بابت اس وقت تک بیرونی دنیا کو کوئی علم نہ تھا۔ اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ایک سینئر پاکستانی افسر نے مقامی اخبار کو بتایا "اس وقت کوئی حتمی اور آخری فیصلہ کرنا قبل از وقت ہوگا۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ بعض سینئر افراد ایسی سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے ہیں جو ان کے منصب کے ہرگز شایانِ شان نہ تھیں۔ بہرکیف! جنوری میں ان گرفتاریوں کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا جس کے دوران میجر اسلام الحق کو حراست میں لیا گیا جو ڈاکٹر خان کے اسٹاف آفیسر تھے اور گرفتاری کے وقت ڈاکٹر خان کے گھر پر ان کے ہمراہ کھانے میں شریک تھے۔ بریگیڈیئر تاجور (سیکیورٹی کے سابق سربراہ) اور ڈاکٹر نذیر احمد (کے آر ایل کے ڈائریکٹر اینڈ ٹیکنالوجی) کو بھی گرفتار کر لیا گیا جو شمالی کوریا سے میزائل پروگرام اور جوہری ٹیکنالوجی کے تبادلے میں ملوث تھے۔ ان میں سے بیشتر افراد کا تعلق مسافروں کے ٹمبکٹو گروپ سے بتایا جاتا ہے، اس طرح مجموعی طور پر کے آر ایل کے ۳۶ افراد کو زیرِ حراست لیا گیا جنھیں پوچھ گچھ کے بعد رہا کر دیا گیا...... کے آر ایل کے تین ڈائریکٹر جنرلز، دو ریٹائرڈ بریگیڈیئرز اور ایک ریٹائرڈ میجر سے خاص طور پر پوچھ تاچھ کی گئی جن میں سے اکثر نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ملوث ہونے کا اقرار کیا۔ ان افراد نے انٹیلی جنس اداروں کو جو فہرست دی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر خان کو کے آر ایل نے کتنے بڑے پیمانے پر مدد فراہم کی تھی۔ جنرل مرزا اسلم بیگ پر یہ الزامات عائد کیے گئے تھے کہ ایران کو سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کی فراہمی ان ہی کے ایماء پر کی گئی تھی جبکہ جنرل

کرامت پر شمالی کوریا کے حوالے سے الزامات موجود تھے۔ تاہم ضروری پوچھ گچھ اور تحقیقات کے بعد یہ دونوں بے قصور ثابت ہوئے۔

دو فوجی جنرلوں کی ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے پوچھ گچھ

بہرطور ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے براہِ راست "مڈبھیڑ" خاصا دشوار مرحلہ تھا، ان کا شمار ایسی شخصیات میں ہوتا تھا جو ملک کے انتہائی اعلیٰ سطح کے حکام ہی سے رابطہ رکھتے ہیں اور بلاواسطہ ملاقاتیں کرتے رہتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے شخص سے پوچھ گچھ کے لیے پاکستان آرمی کے دو اعلیٰ حکام کا انتخاب کیا گیا یعنی لیفٹیننٹ جنرل خالد قدوائی جو نیشنل کمانڈ اتھارٹی کے انچارج تھے اور لیفٹیننٹ جنرل احسان الحق جو آئی ایس آئی کے سربراہ تھے۔ یہ دونوں حکام دسمبر کے مہینے میں تمام تر ثبوت اور شواہد ہمراہ لے کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے گھر پہنچ گئے۔ یہ ملاقات خاصے ناخوشگوار اور کشیدہ ماحول میں شروع ہوئی، پہلے پہل تو ان اعلیٰ فوجی حکام نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کیا جس کے فوراً بعد انھوں نے عائد کردہ الزامات کی فہرست گنوانا شروع کردی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان عام طور پر ایک ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں اور دھیمے لب و لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے بھی اسی طرح کے رویے کی توقع رکھتے ہیں، انھیں تلخ گوئی یا تصادم و محاذ آرائی قطعاً پسند نہیں ہے، چنانچہ جب ان دونوں فوجی افسران نے ان سے سوالات پوچھنے شروع کیے تو ان کا پارہ چڑھ گیا۔ انھوں نے بے اختیار چیخنا اور چلانا شروع کردیا اور فوجی افسران سے بولے "تم لوگ میری بے عزتی کر رہے ہو؟" فوجی حکام نے کہا "یا تو آپ ان تمام الزامات کو من و عن قبول کرلیں ورنہ ہم اس معاملے کو عوام تک لے جانے پر مجبور ہوں گے۔" تاہم ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کسی بھی الزام کو تسلیم کرنے سے واضح طور پر انکار کردیا۔ فوجی حکام نے انھیں ڈھکے چھپے انداز میں دھمکیاں دینا شروع کردیں۔ بعض خبروں کے مطابق ان فوجی افسران نے ڈاکٹر

عبدالقدیر خان کو یہ دھمکی بھی دی کہ وہ "ان کی صاحبزادی کی حفاظت کی کوئی ذمہ نہیں لے سکتے۔" تاہم یہ واضح نہیں ہوسکا کہ اس بات سے ان کا اصل مفہوم کیا تھا؟ دورانِ گفتگو گوانتاناموکا بھی ذکر آیا۔ بہرصورت جنرل خالد قدوائی اور جنرل احسان الحق کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ہاں سے خالی ہاتھ ہی واپس آنا پڑا۔ اس مرحلے پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہونے لگا کہ ان کی شہرت و مقبولیت انھیں بچانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ وہ یہ سوچ کر کافی ذہنی پریشانی اور خلفشار کا شکار ہوگئے۔ وہ تو خود کو ہر ایک چیز سے بالاتر اور ماورا تصور کرتے تھے چنانچہ انھوں نے اس بات کی سرتوڑ کوشش شروع کردی کہ اس ضمن میں موجود تمام شواہد کو تلف کردیا جائے۔

انھوں نے نومبر اور دسمبر کے دوران ایک نمایندے کو تین مرتبہ دبئی بھیجا تاکہ جتنے ثبوت اور شواہد ملیں انھیں ضائع کردیا جائے۔ انھوں نے ایران سے ہونے والے رابطوں کے بھی تمام ثبوت مسخ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اس نمائندے کو بعد میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ادھر دوسری جانب ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنے دفاع کے لیے بھی تیاری شروع کردی۔ اس مقصد سے ان کے قریبی احباب اور دوستوں نے پاکستانی اور غیر ملکی صحافیوں سے رابطے قائم کرکے انھیں باور کرانے کی کوشش کی کہ "یہ سب سراسر جھوٹ ہے، صدر جنرل پرویز مشرف امریکا کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔" ان کے قریبی رفقاء اور احباب اس بات کا اشارہ دے رہے تھے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اتنی آسانی سے یہ سارا ملبہ اپنے اوپر گرنے نہیں دیں گے نہ ہی وہ یہ سارے الزامات اپنی ذات پر لیں گے۔ انھوں نے اپنے قریبی دوستوں اور احباب کو بتادیا تھا کہ "جنرل ضیاء الحق کے بعد آنے والے تمام آرمی چیفس ان کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف ہیں، وہ ان سب کو پوری طرح بے نقاب کردیں گے اور ہر بات کا انکشاف ہوگا لہٰذا انھیں "قربانی کا بکرا" بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔" ۲۴ دسمبر کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی

صاحب زادی دینا نے بی بی سی پر یہ بیان دیا ''میرے گھر کا ہر فرد اس حقیقت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو بچانے کی خاطر میرے والد کو ''قربانی کا بکرا'' بنایا گیا ہے، ہم بھی انتظار کر رہے ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ ان الزامات کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔'' دوسری جانب ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے۔ وہ پاکستانی سیاست کے تمام نشیب و فراز اور پیچ و خم سے بخوبی آشنا تھے، انھیں بھی اپنے تحفظ کے لیے کسی ضمانت کی اشد ضرورت تھی چنانچہ دسمبر کے مہینے میں یہ خبریں عام ہونے لگیں کہ جوہری ٹیکنالوجی کے تبادلے سے متعلقہ اہم ترین معلومات ملک سے باہر بھیجی جا رہی ہیں جن میں ویڈیو ٹیپس، آڈیو ٹیپس اور ایسے کاغذات اور دستاویزات شامل ہیں جن میں براہ راست اور بلاواسطہ ان سرگرمیوں میں پاکستان کی مسلح افواج کو ملوث بتایا گیا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلح افواج کے تمام سربراہوں کو ان سرگرمیوں کا بخوبی علم تھا بالخصوص وہ شمالی کوریا سے کیے جانے والے لین دین سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان سربراہان میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کا نام بھی تھا، اس کے علاوہ ملک سے باہر بھیجی گئی ان اطلاعات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ جوہری ٹیکنالوجی کے سودوں میں بعض فوجی افسران نے لاکھوں ڈالر کما لیے ہیں۔ یہ اطلاعات بھی موصول ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی صاحبزادی جن کے پاس برطانوی اور ڈچ دونوں پاسپورٹ موجود تھے اور جو اس وقت لندن میں مقیم تھیں، دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کر کے یہ معلومات اور اطلاعات پہنچا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پاس شواہد کی کوئی کمی نہ تھی کیونکہ ۱۹۷۶ء میں نیدرلینڈ سے پاکستان واپس آنے کے بعد سے وہ انگریزی میں اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے جس کے بارے میں ان کے احباب کا ماننا تھا کہ یہ روزنامچے درحقیقت ان کی ''انشورنس پالیسی'' ہے۔ انھوں نے اپنے روزنامچوں کے یہ دفتر ''دھات'' سے بنے ایک بہت بڑے صندوق میں محفوظ

کر رکھے تھے اور عام طور پر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ ''میں اس صندوق کی چابی کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔'' تاہم فی الوقت یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی تحریر کردہ یہ تمام ڈائریاں (روزنامچے) کہاں ہیں؟ بعض افراد کا کہنا ہے کہ ان تمام روزنامچوں کو بھی پاکستان سے باہر بھیج دیا گیا ہے۔ بہر طور امریکی حکومت کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا لیکن وہ جنرل پرویز مشرف جیسے کلیدی اتحادی کی قیمت پر اس نیٹ ورک کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مشرف دہشت گردی کے خلاف امریکا کی غیر معمولی امداد کر رہے تھے۔ امریکی حکومت نے جنرل پرویز مشرف کی ذات اور شخصیت پر اندھا اعتماد کر رکھا تھا جس کے نتیجے میں پاکستان وسیع تر جمہوری اداروں کی تشکیل سے بھی محروم ہی رہا۔ جنرل پرویز مشرف پر دو مرتبہ قاتلانہ حملے کی ناکام کوششوں نے واشنگٹن میں اس تصور کو مزید راسخ کر دیا کہ انھیں مزید وقت دیا جائے تاکہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو روکنے کی غرض سے کوئی موزوں اور مناسب طریقہ تلاش کر سکیں تاہم امریکی حکومت نے جہاں تک ممکن ہو سکا صدر جنرل پرویز مشرف کی مضبوط پوزیشن پر کسی بھی طرح کا کوئی حرف نہیں آنے دیا۔

ان تمام حقائق اور واقعات کے باوجود امریکی حکومت نے صدر جنرل پرویز مشرف کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے جو وقت دیا تھا وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ ایران اور شمالی کوریا کی جوہری ٹیکنالوجی کی فراہمی کی خبریں عام تھیں، اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف کوئی فیصلہ کرنا پرویز مشرف کے لیے خاصا دشوار ہو رہا تھا۔ رہی سہی کسر لیبیا کے واقعات نے پوری کر دی تھی۔ اس بات میں بھی کوئی شبہ موجود نہیں تھا کہ لیبیا کو یہ پروگرام کس نے دیا ہے؟ یہ اطلاعات بھی عام طور پر گردش کر رہی تھیں کہ ڈاکٹر خان نے لیبیا کو ہتھیاروں کے ڈیزائن بھی فراہم کیے ہیں، لہٰذا اب یہ معاملہ صرف سویلین ٹیکنالوجی کی فراہمی تک محدود نہ رہا تھا۔ اب تک

صدر مشرف یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ امریکی دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ کسی براہ راست ٹکراؤ، تصادم اور محاذ آرائی کی نوبت نہیں آئے گی لیکن لیبیا کا راز طشت از بام ہو جانے کے بعد ان کی یہ ساری امیدیں خاک میں مل چکی تھیں۔ بہر نوع تمام حالات کے اس نہج پر پہنچ جانے اور ساری امیدوں پر پانی پھر جانے کے باوجود جنرل پرویز مشرف نے ''پاکستان کے قومی ہیرو'' کے خلاف کسی بھی اقدام سے اجتناب برتا۔ امریکی حکومت کی جانب سے پاکستان پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا لیکن پاکستانی حکومت کا مسلسل یہی کہنا تھا کہ وہ اس پورے معاملے کا جائزہ لے رہی ہے اور اسے مزید شواہد، معلومات اور ثبوت درکار ہیں۔ واشنگٹن کی بے چینی اور احساسِ محرومی برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے امریکی حکومت کے صبر اور تحمل کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ برداشت کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے، معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کولن پاول جنرل پرویز مشرف سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ''اب میں ایک اچھے دوست کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جنرل کی حیثیت سے آپ کے ساتھ بات کروں گا۔'' کولن پاول کی گفتگو کے لب و لہجے، انداز اور آواز کے زیر و بم سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس گفتگو کی نوعیت بہر صورت دوستانہ ہرگز نہیں ہوگی۔ کولن پاول نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''واشنگٹن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے بس بہت ہو چکا۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے لیبیا کو جوہری ٹیکنالوجی فراہم کی ہے جس کی اطلاعات عام ہونے ہی والی ہیں۔ امریکی صدر جارج بش خود بھی اس مسئلہ پر تقریر کرنے والے ہیں۔ اس طرح کے واقعات پاکستان کو بڑے سنگین خطرات سے دوچار کر دیں گے اور اس کے پاس تردید اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جائے گی۔ انھوں نے جنرل مشرف کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ خود بھی یہی چاہیں گے کہ اس معاملے میں کوئی اہم قدم اٹھایا جائے، میں بھی آپ سے یہی کہوں گا کہ اس ضمن میں فوری کوئی فیصلہ کریں۔'' بہرکیف!

ان تمام مشوروں میں چھپی دھمکیوں کو صدر جنرل پرویز مشرف نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ انھیں امریکی حکومت کا واضح پیغام مل چکا تھا۔ ۳۱ جنوری ہفتے کا دن تھا جب ''نیشنل کمانڈ اتھارٹی'' کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس کے بعد رسمی طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ان کے منصب سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ ''وزیر اعظم پاکستان کے خصوصی مشیر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔'' اس دن ڈاکٹر خان کے مکان پر فوجی گارڈز تعینات کر دیے گئے، اب وہ اپنے ہی مکان میں نظر بند کیے جا چکے تھے تاہم لوگوں سے یہی کہا گیا کہ ان کی سیکورٹی میں مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔

صدر جنرل پرویز مشرف اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان روبرو

اگر آپ باہر سے عمارات کے اس سلسلے کو دیکھیں تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ ان عمارات میں پاکستان کی بدنام زمانہ انٹیلی جنس ایجنسی کے دفاتر قائم ہیں جو اسلام آباد کے مضافات میں واقع ہیں۔ جب آپ اس کے دس فٹ بلند سیاہ رنگ کے دروازے سے اندر داخل ہو کر سبزے کے صحن سے گزر کر شیشے کے دروازوں تک پہنچیں گے تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ آپ آئی ایس آئی کے دفتر پہنچ گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پوچھ گچھ کے لیے یہیں لایا گیا تھا۔ آئی ایس آئی کے سربراہ اور دیگر حکام نے انھیں بتایا کہ ہر بات صاف صاف اور سچ سچ بتا دیں۔ بہرکیف اس کھیل کے آخری مرحلے میں جنرل پرویز مشرف نے یہ حکم دیا کہ ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو یکم فروری کو ان کے روبرو پیش کیا جائے۔'' ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور جنرل مشرف ایک دوسرے کے روبرو آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جنرل نے ڈاکٹر خان سے کہا ''مجھے ہر بات صاف صاف بتا دیں۔ مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر عبدالقدیر خان بدستور ہر بات سے انکار کرتے رہے اور بولے ''اس سلسلے میں کوئی ثبوت اور کسی بھی قسم کے شواہد موجود نہیں ہیں۔ یہ سارا مخمصہ امریکا نے کھڑا کیا ہے۔'' یہ سن کر پرویز مشرف نے دستاویزی شواہد کا

پلندہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے سامنے اٹھا کر پھینک دیا۔ انھوں نے بعد میں اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے اس ملاقات کے دوران انھیں صرف ایک ہی بار اس وقت سخت غصہ آیا تھا جب ڈاکٹر خان نے ان سے کہا کہ ''انھوں نے بھٹو کے دو قریبی ساتھیوں کے کہنے پر (جواب اس دنیا میں موجود نہیں) ایران کو جوہری ٹیکنالوجی فروخت کی تھی۔'' پرویز مشرف نے وہ تمام شواہد ان کے سامنے رکھ دیے جو ڈاکٹر خان کے دعووں کی کھلی تردید کر رہے تھے جن میں کے آر ایل کے عہدیداروں کے اعترافات، دبئی میں جعلی اور فرضی ناموں سے کھولے گئے لاکھوں ڈالر کے بینک اکاؤنٹس اور ایرانی حکام کے نام ان کا خط جس میں انھیں تاکید کی گئی تھی کہ وہ تمام ساز و سامان کہیں اور منتقل کردیں جو انھوں نے کے آر ایل سے حاصل کیا تھا، چنانچہ اب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں بچا تھا۔ اپنا دفاع کرنے کی ان کی تمام تر کوششیں ناکامی سے دوچار ہو چکی تھیں۔ زمین ان کے قدموں تلے سے نکل چکی تھی۔ تاہم یہ سوال اپنی جگہ موجود تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف کیا اقدام کیا جائے؟

اعلیٰ سطح کے پاکستانی حکام مسلسل اس امکان پر غور کرنے میں مصروف تھے۔ یہ کوئی آسان اور سادہ سی بات ہرگز نہ تھی۔ امریکی اور برطانوی حکومتوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر کوئی بھی شخص قانون شکنی کا مرتکب پایا گیا تو وہ بلاشبہ مستوجب تعزیر ہوگا۔ تاہم سزا اور تعزیر کا تصور پاکستانی حکومت کے لیے کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ اس پورے معاملے کو عوام تک لانا بھی نہایت تباہ کن ہو سکتا تھا۔ دوسری جانب ''برآمدی کنٹرول کے قوانین'' کے کمزور اور غیر مؤثر ہونے کے نتیجے میں یہ بات فوری طور پر واضح نہیں تھی کہ ''آفیشل سیکریٹ ایکٹ'' کی خلاف ورزی کے علاوہ بھی ان پر کیا الزامات عائد کیے جا سکتے ہیں؟ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پاکستان میں انتہائی وسیع پیمانے پر عوامی تائید و حمایت اور شہرت و مقبولیت حاصل تھی، چنانچہ ان کے خلاف کوئی بھی اقدام یا فیصلہ حکومت کو عدم استحکام

سے دوچار کرنے کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ یہ سوال بھی اپنی جگہ بے حد اہم تھا کہ پاکستانی مسلح افواج کے سینئر جرنیلوں کے بارے میں ان کے پاس کیا معلومات اور اطلاعات موجود ہیں؟ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسی قومی شخصیت پر مقدمہ چلانا بھی ممکن نہ تھا نہ ہی انھیں امریکا کے حوالے کر دینا کوئی آسان کام تھا کیونکہ اس طرح وہ بے شمار رازوں اور شخصیات پر سے نقاب اٹھا کر انھیں بے پردہ کر سکتے تھے اور وہ تمام حقائق منظر عام پر لا سکتے تھے جو حکومت کی خواہش کے برخلاف تھے۔ ان حالات کے تحت ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان عوام کے رُوبرو آ کر اپنے جرم کا اعتراف کرلیں اور تمام اقدامات، اعمال اور سرگرمیوں کی تمام تر ذمہ داری خود اپنے کاندھوں پر ڈال دیں تاکہ اس طرح حکومت پاکستان، مملکت پاکستان اور پاکستان کی مسلح افواج کے جرنیلوں کو کسی بھی پریشانی اور پشیمانی سے بچایا جا سکے۔ اس عوامی اعتراف جرم کے عوض انھیں معاف کر دیا جائے گا اور اس طرح وہ ایک بھیانک جرم سے بھی بچ جائیں گے!!!

اس تمام کارروائی کے لیے ایک معاہدہ درکار تھا۔

سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر کا کردار

اس معاہدے کو تحریر کرنے کی غرض سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ایک دیرینہ دوست اور پاکستان کے سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر سے رابطہ کیا گیا۔ ایس ایم ظفر ان دنوں پاکستان سینیٹ کے ایک رکن بھی تھے اور ان کا شمار پاکستان کے انتہائی ذہین، قابل اور لائق پاکستانی وکلاء میں کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں نیدرلینڈ کی ایک عدالت میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا مقدمہ بھی لڑ چکے تھے۔ چنانچہ وہ اسلام آباد میں ڈاکٹر خان کی قیام گاہ پہنچے تاکہ ان سے معاملے کی تفصیلات طے کی جا سکیں۔ ڈاکٹر خان کافی ڈپریشن کا شکار نظر آئے۔ وہ بہت زیادہ تناؤ اور کشیدگی میں مبتلا تھے اور خاصے بدحواس دکھائی دے رہے تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے؟؟ ڈاکٹر

عبدالقدیر نے ایس ایم ظفر کو بتایا کہ ان پر خواہ مخواہ الزامات کی بارش کردی گئی ہے جو لوگ ان پر یہ الزام لگا رہے ہیں درحقیقت وہی ان سرگرمیوں کے اصل ذمے دار ہیں۔ بہرحال یہ معاہدہ بہت واضح اور صاف تھا ''اعتراف جرم کرلو، کچھ اور مت کہو، تمھیں معافی مل جائے گی۔'' ان سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ ''وہ تمام تر باتوں کا انکشاف اسی مرحلے پر کردیں ورنہ اگر کوئی نئی معلومات اور اطلاعات بعد میں منکشف ہوئیں تو اس کی ذمے داری ان کے کاندھوں پر ہوگی۔''

اعتراف نامے پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے دستخط

ڈاکٹر عبدالقدیر خان بارہ صفحات پر مشتمل ''اعتراف نامے'' پر دستخط کے لیے رضامند ہوگئے جسے سرکاری طور پر ''فرسٹ انفارمیشن رپورٹ'' یا ''ایف آئی آر'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کو آج تک شائع نہیں کیا گیا نہ ہی پاکستان کے عوام کو اس کے مندرجات کا ہی کوئی علم ہے۔ امریکی حکومت بھی ان سے کیے جانے والے مذاکرات اور گفتگو میں بظاہر شریک نہ تھی لیکن اس نے اپنی وہ کم سے کم شرائط ضرور واضح کردیں تھیں جن کے دائرے میں رہتے ہوئے پرویز مشرف بعض بنیادی مقاصد حاصل کرسکتے تھے۔ ڈاکٹر خان کو جوہری ٹیکنالوجی کے شعبے سے ہمیشہ کے لیے برطرف کردیا گیا تھا۔ ان کے بیرون ملک اور اندرون ملک سفر پر سخت پابندی عائد کردی گئی تھی۔ امریکی حکومت نے یہ بھی واضح کردیا تھا کہ اب تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سرگرمیوں اور کارروائیوں کی نگرانی اور جانچ پڑتال کے لیے جاسوسی اور سراغ رسانی کے جو ذرائع استعمال کیے جارہے تھے آج کے بعد وہی ذرائع یہ نگرانی کریں گے کہ آیا حکومت پاکستان نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر جو پابندیاں عائد کی ہیں ان پر حقیقی معنوں میں عملدرآمد بھی ہورہا ہے یا نہیں!!!

4 فروری کو نیشنل کمانڈ اتھارٹی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں ان تمام حتمی تفصیلات کی توثیق کردی گئی جن کا تعلق ڈاکٹر خان کے اعترافی بیان سے تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان

نے دوسری بار جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کی جو 45 منٹ تک جاری رہی۔ ملاقات کی تصویر میں جنرل پرویز مشرف اپنی فوجی وردی میں ملبوس دکھائی دے رہے ہیں جبکہ ڈاکٹر خان سفاری سوٹ میں نظر آرہے ہیں۔ اس ملاقات کے دوران ڈاکٹر خان نے تمام تر سرگرمیوں کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی اور صدر مملکت سے رحم کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ انھیں معافی دے دی جائے۔ جنرل پرویز مشرف نے کہا کہ پوری قوم گذشتہ دو ماہ کے دوران پیش آنے والے واقعات پر شدید تشویش اور صدمے کا شکار ہے۔ وہ نیشنل کمانڈ اتھارٹی سے صلاح مشورہ کرکے ان کی رحم کی درخواست پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا انھیں معافی دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا کہنا ہے کہ ''صدر جنرل پرویز مشرف نے اس بے تکلفی کو بے حد سراہا جس کے ساتھ میں نے انھیں تمام تر تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان شاء اللہ وہ اپنی کابینہ سے ضروری صلاح مشورہ کریں گے۔ وزیراعظم اور اپنے دیگر ساتھیوں کی رائے لیں گے اور پھر کوئی فیصلہ کریں گے کہ کس طرح اس معاملے کو ختم کیا جاسکتا ہے۔''

قوم کے روبرو ٹیلی ویژن پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا اعتراف جرم

اسی روز سہ پہر ڈاکٹر خان کو اسلام آباد میں پاکستان ٹیلی ویژن کی عمارت میں لے جایا گیا تاکہ وہ اپنی اس قوم سے خطاب کرسکیں جس نے ان کی پرستش کی تھی۔ تاہم ان کے احباب اور دوستوں نے اس بات کی شدید مخالفت کی تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ٹیلی ویژن پر آکر اپنے جرم کا اعتراف کریں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ طریقہ انتہائی ذلت آمیز ہوگا لیکن حکومت کا یہی مطالبہ اور اصرار تھا کیونکہ اس کے نزدیک یہی وہ واحد راستہ تھا جو عوام کے اضطراب اور سکتے کے عالم کو توڑ سکتا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر خان نے ٹیلی ویژن پر اعتراف جرم کی غرض سے اردو کے بجائے انگریزی کو ترجیح دی تاکہ پاکستانیوں کے علاوہ بقیہ تمام دنیا بھی ان کے اعترافات کو سن سکے اور اسے یقین ہوجائے کہ حکومت

پاکستان اس مسئلے کو پوری سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کی خواہاں ہے۔ بہرطور ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنے اعتراف جرم کی تقریر پڑھنے کے لیے "ٹیلی پرامپٹر" کا استعمال مسترد کرتے ہوئے اپنی لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کو ترجیح دی اور اپنے لکھے ہوئے نوٹس سے مدد لیتے رہے۔ اپنی تقریر کے دوران انھوں نے گذشتہ دو ماہ کے واقعات پر اپنی گہری تشویش اور معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے ملک اور وطن کو فول پروف سیکیورٹی کا نظام دینے کے خواہش مند تھے اور ان کی پوری زندگی اسی خواہش کے حصول سے عبارت رہی ہے۔ تاہم میری یہ تمام کوششیں اب میری قوم کے لیے رائیگاں ثابت ہو رہی ہیں کیونکہ میں نے "انتہائی نیک نیتی" کے ساتھ جو کچھ بھی کیا وہ غلط اندازوں اور غلط فیصلوں کے نتیجے میں جوہری پھیلاؤ کی غیر قانونی سرگرمیوں میں شمار کیا گیا۔ بہرنوع انھوں نے اپنی اس تقریر میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا کہ "جو شواہد ان کے خلاف پیش کیے گئے ہیں ان میں بیش تر صحیح اور درست ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ اصل تقریر میں نیک نیتی کا لفظ موجود نہیں تھا اسے ڈاکٹر خان نے بعد میں تقریر میں شامل کیا تھا تاکہ یہ تاثر دور کیا جاسکے کہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ کسی حرص، لالچ یا طمع کے سبب نہ تھا بلکہ اس کے پس پشت ان کے جذبۂ حب الوطنی کے محرکات پوری طرح کارفرما تھے۔ اپنی تقریر کے آخر میں انھوں نے تمام ذمہ داریاں قبول کرتے ہوئے پاکستانی شہریوں سے اپیل کی کہ وہ اعلیٰ ترین قومی مفادات کے پیش نظر کسی بھی قسم کی قیاس آرائی سے گریز کریں اور قومی سلامتی کے حساس ترین موضوع کو سیاسی موضوع ہرگز نہ بنائیں۔ انھی الفاظ کے ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی تقریر اور طویل کیریئر دونوں کا خاتمہ ہوگیا۔

تمت بالخیر!

پاکستان کے نامور سائنس دان اور اسلامی ایٹم بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شخصیت بین
الاقوامی سطح پر شہرت کی حامل ہے جو عالم اسلام کا ایک ایسا مایہ ناز سپوت ہے کہ پوری مسلم دنیا اس کے بے نظیر
کارنامے کی وجہ سے اُسے اپنا محسن اور ہیرو تسلیم کرتی ہے۔ یورینیم کی افزودگی کے ارزاں طریقے کی دریافت پر
انھیں عالمی سطح پر بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔
دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہریوں کو ایٹم بم کی اذیتوں اور ہلاکتوں سے
آشنا کرنے والے امریکی اب دنیائے اسلام کے سب سے بڑے ایٹمی صلاحیت کے حامل ملک پاکستان کے
مایہ ناز فرزند ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جنھیں پوری پاکستانی قوم اپنے محسن کا درجہ دیتی ہے
بلکہ مسلم امہ کے قومی ہیرو کے طور پر ان کا احترام کرتی ہے کیونکہ وہ پاکستانی ایٹم
Gorden گورڈن کوریا
مغربی دنیا کے نمائندہ ایک برطانوی نژاد صحافی
کی ایک کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا عنوان ہے:
Shoping for Bombs
(Nuclear Proliferation, Global Insecurity and the
Rise and Fall of the A.Q. Khan Network)
یہ کتاب درحقیقت ایک ''فردِ جرم'' کا درجہ رکھتی ہے جو اس مایہ ناز فرزند قوم پر عائد کی گئی ہے۔ مسلم
امہ کے ارباب فکر و دانش کی یہ ملی اور دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے افکار و خیالات سے جو مسلمانوں کے
خلاف پوری دنیا میں پھیلائے جا رہے ہیں پوری مسلم دنیا کو آگاہ رکھیں۔ یہ افکار و تاثرات مخالفانہ، منفی اور دشمنی و
نفرت پر مبنی ہی سہی لیکن ان سے آگاہ رہنا ہم سب کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے
اپنے دشمن کی سوچ اور عزائم سے پوری طرح روشناس رہ سکیں۔ جھوٹ یا سچ، ہمارے بارے میں جو کچھ بھی کہا اور
لکھا جا رہا ہے اس کا ہمارے علم میں ہونا ضروری ہے تاکہ ہم حقائق کی میزان پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا
پانی کر سکیں۔
Designed by: Naveed Ahmad 0321 8401998
50695
Rs. 150/-